بچھڑی پرچھائیاں

(سفرنامے، انٹرویوز، تبصرے، شخصیات (تاثراتی خاکے) اور متفرق تحریریں)

کس تربیتِ خوش نگہی کا یہ صلہ ہے
اعزاز مری فکر و نظر کو جو ملا ہے

صلاح الدین نیّر

تاریخ وسن اشاعت : یکم جون ۱۹۹۳ء

تعدادِ اشاعت پہلی بار : ایک ہزار

طباعت : اعجاز پرنٹنگ پریس۔ چھتہ بازار۔ حیدرآباد ۲

طباعت سرورق : انتخاب پریس۔ جواہرلال نہرو روڈ۔ حیدرآباد ۱

ناشر : صلاح الدین نیّر

ترتیب وتزئین : صالحہ الطاف۔ فاطمہ تاج

جزوی رقمی اعانت : اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

قیمت عام خریداروں کے لئے : ۲۵/- روپے

بک سیلرز اور لائبریریوں کے لئے : ۴۰/- روپے

-: ملنے کے پتے :-

☆ حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ پتھر گٹی۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲

☆ مصنف۔ کہکشاں۔ ۱۱-۳-۸۲۴/۷، ملے پلی، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

- فون نمبر : 228802

اِنتسابؒ

جناب زاہد علی خاں کے نام

وہی انداز دلداری، وہی مسلک، وہی لہجہ
نہ آیا فرق اب تک بھی تمہاری وضع داری میں

صلاح الدین نیر

خراجِ عقیدت

جناب عابد علی خاں

بلندیاں اُتر آتی تھیں اُس کے آنگن میں
زمیں پہ رہتا تھا وہ شخص آسماں کی طرح

●

صلاح الدین نیّر



صلاح الدين نير

ترتیب و تزئین

عکس در عکس

خدو خال

جائزہ

اوراقِ دل

پیش لفظ

میں اپنی پچھلی تحریروں میں لکھ چکا ہوں کہ کسی ہمعصر شاعر یا ادیب پر قلم اُٹھاتے وقت عجیب کیفیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایسا ہی ایک مرحلہ اِس وقت درپیش ہے۔ صلاح الدین نیّر کی تازہ تخلیق "پھر وہی پرچھائیاں" اِس وقت میرے پیشِ نظر ہے اور اس پر مجھے کچھ لکھنا ہے۔

"پھر وہی پرچھائیاں" ایک شاعر کی نثری تخلیق ہے۔ یہ ایک دلچسپ تضاد ہے اور اس تضاد سے عہدہ برآ ہونا اس وقت ممکن ہے جبکہ اہلِ قلم پُر اعتماد ہو اور یہ اعتماد نیّر کو حاصل ہے۔ شعری مجموعوں کے ساتھ ساتھ اب تک انکی جو نثری کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نثر نگار اس میدان میں بھی بڑی کامیابی کے ساتھ گامزن ہے۔

"پھر وہی پرچھائیاں" متنوع تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں نیّر کے سفرنامے بھی ہیں۔ انٹرویوز بھی ہیں۔ معاصرین کی کتابوں پر کئے ہوئے تبصرے بھی ہیں، اپنے ساتھی بعض شاعروں اور ادیبوں کی حیات اور کارناموں پر جائزے بھی ہیں، اور وہ دیباچے یا پیش لفظ بھی ہیں جو نیّر نے خود اپنے شعری مجموعوں پر لکھے ہیں۔ نیّر کو موضوعات کے تنوع کی مناسبت سے طرزِ نگارش اختیار کرنی پڑی ہے۔ سفرناموں کا انداز بیانیہ ہے، انٹرویوز میں محققانہ اور تبصروں میں ناقدانہ ہے۔ جناب نیّر جیسے پُرگو اور زُودگو شاعر ہیں ویسی ہی زود نویسی ان کی نثر نگاری میں

بھی ہے۔ وہ بے تکان لکھتے جاتے ہیں اور اس تیز روی میں بھی وہ اپنا توازن قائم رکھتے ہیں۔ تسلسل مدعا کہیں بے ربطی نہیں آنے پاتی۔ یہ صلاحیت انہوں نے بڑی مشقت اور ریاضت سے پیدا کی ہے۔

سفر نامے جو تحریر کئے گئے ہیں وہ اتنے تفصیلی ہیں کہ انھیں رپورتاژ کہا جا سکتا ہے جس میں سفر کے کسی جزو کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ واقعات کے تسلسل میں گرد و پیش کے ماحول کو سمیٹتے ہوئے ان افراد سے بھی متعارف کروایا گیا ہے جو اس سفر نامہ کے ذیلی کردار ہیں۔ مشاعرہ کا جہاں ذکر کیا ہے اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ دیار مدینہ کی یادداشتوں میں جہاں تیسیر جذباتی طور پر متاثر ہوئے ہیں تو وہیں جذبات کی شدت ان کے قلم سے ٹپک پڑی ہے۔

"خانۂ کعبہ میں شبِ معراج کی نورانی گھڑیاں فیضان و برکات کا دریا بہا رہی تھیں۔ مکہ معظمہ کی نورانی کیفیات سے گذرنے کے بعد ہماری آنکھیں گنبدِ خضرا کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو گئیں۔ مدینہ کے ذرہ ذرہ اور اس کے صبح و شام میں جو جمالیاتی کیفیات چھائی ہوئی ہیں ان کے اظہار سے قلم عاجز ہے۔ ایک سیدھے سادے مسلمان کے دل پر خانۂ کعبہ کی کیفیت کا کچھ اور ہی اثر ہوتا ہے اور گنبدِ خضریٰ کے نظارے کی کیفیت کچھ اور ہی کیف و سرور بخشتی ہے۔"

انٹرویوز اس اعتبار سے دلچسپ، مفید اور کارآمد ہیں کہ یہ سماج کے مختلف طبقات کی شخصیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ تلگو کی ممتاز شخصیت ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کی اُردو زبان سے محبت اور دلچسپی نے اُردو والوں پر جو اثرات مرتب کئے ہیں اسکی ترجمانی جناب تیسیر کے انٹرویو سے ہوتی ہے، اس کی تمہید بڑی خوش اسلوبی سے قائم کی گئی ہے۔

"انسان کو اپنی زندگی میں کچھ ایسے انسانی رشتوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے جن کی وابستگی سے فہم و فراست کے بیشتر گوشے اُجالوں کا سفر طئے کرتے ہوئے پُر نور فضا میں پھیل جاتے ہیں۔ زندگی کے سفر میں کچھ ایسی شخصیتوں سے بھی ملاقات ہوجاتی ہے جن سے مل کر فکر و خیال، شعور و وجدان کی شمعیں جگمگانے لگتی ہیں اور جن کی محبت، عنایت، مروت، روشن خیالی اور خوش مزاجی کی وجہ سے معاشرہ کے خد و خال میں رنگ و نور کی بارش ہونے لگتی ہے۔"

اُردو زبان و شاعری سے ڈاکٹر موصوف کی غیر معمولی دلچسپی کا ثبوت میرے اس بیان سے ملے گا کہ تلگو اسکالرز کی ایک خاص نشست انھوں نے تلگو یونیورسٹی میں رکھی تھی جس میں، میں بھی شریک تھا اور پیر بھی۔ اس نشست میں ڈاکٹر صاحب نے یہ سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ اُردو کے عروض اور تلگو کے اوزانِ شاعری میں کس حد تک مماثلت ہے۔

حیدرآباد کی پروین کمال جو ترکِ وطن کر کے جرمنی میں سٹل ہوگئی ہیں ان کا انٹرویو اس لحاظ سے دلچسپ و مفید ہے کہ اس کے ذریعہ وطن سے دور رہنے والوں کے خیالات اور نفسیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروین کمال کے الفاظ ہیں:

"اس کو کیا کہئے کہ ترکِ وطن کر کے برسوں بعد بھی ہم اپنی زمین کا حصہ بنے رہتے ہیں، لاکھ کوشش کے بعد بھی وہاں کے معاشرہ کا مکمل جزو نہ بن سکی ..... جسمانی طور پر فرینکفرٹ (جرمنی) میں رہتی ہوں لیکن ذہنی طور پر اپنے وطن عزیز سے کبھی دور نہیں رہتی۔"

اس ضمن میں جرمنی کے معاشرہ کی تصویر بھی سامنے آتی ہے۔

"وہاں کے لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ رشتوں کو نبھاتے رکھیں۔ بڑے ملکوں کی طرح جرمنی میں بھی انسان مشین بن گئے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے مسائل میں اُلجھے ہوئے رہتے ہیں۔ آباد شہروں میں لگتا ہے کہ لوگ تنہائی کے عادی ہوگئے

جارہے ہیں۔ ایسا احساس، انسانی رشتوں کیلئے ایک سوالیہ نشان بنتا جارہا ہے"

فاطمہ تاج کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"آج جب میں فاطمہ تاج کے بارے میں لکھنا چاہ رہا ہوں تو مجھے عظمت عبدالقیوم کی بہت یاد آرہی ہے۔ جب کوئی باصلاحیت اہلِ قلم خاتون، محفلِ خواتین سے وابستہ ہوجاتیں تو عظمت آپا کو بے حد خوشی ہوتی تھی۔ عظمت عبدالقیوم، جواہر پاروں، سیپے موتی اور ہیروں کی تلاش و جستجو میں ایک خوشگوار مسرت محسوس کرتی تھیں۔ (فاطمہ تاج)

"پھر وہی پرچھائیاں" کا ایک نہایت کارآمد حصہ وہ متفرق تحریریں جو دیباچے یا پیش لفظ کی صورت میں جناب نیر نے خود اپنی تخلیقات کے آغاز میں لکھی ہیں ان سے نہ صرف شاعر کی شاعری کے خدوخال سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ ان کے نظریہ شاعری اور ان کے فکر کے انداز پر بھی روشنی پڑتی ہے جس سے شاعر کے اندرون کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

"میں ایسی شاعری کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں جو زندگی کی روشن اور تعمیری اقدار کی ترجمان ہو ۔"

"شاعری زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار حالات و تجربات کا نچوڑ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ زندگی کے حقائق اور اپنے جذبات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کروں میری تمام غزلوں میں آپ میرے دل کی دھڑکنیں سنیں گے ۔"

"خوشبو کا سفر تو اُس لمحے سے جاری ہے جب سے میں نے خود کو محسوس کرنا شروع کیا لیکن زندگی میں اچانک کچھ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جن سے انسان آشنائی نبھاتا ہے اور اس منصب سے اپنے آپ کو روشناس کراتا ہے۔ اس لئے کہ اپنی پہچان کے لئے دوسروں کی شناخت ضروری ہے ۔"

صلاح الدین نیر کی نثر نگاری یہاں تک ہی محدود نہیں ہے۔ ان کی نثری فتوحات میں ایسے بے شمار تبصرے اور تنقیدیں بھی ہیں جو انھوں نے معاصرین کی تخلیقات پر کی ہیں۔

تبصرہ نگاری کا فن بڑی عرق ریزی کا فن ہے جو معلومات کے وسیع پس منظر کا متقاضی ہے جناب عقیل نے نہ صرف تبصرہ کی روایت کو نبھایا ہے بلکہ تنقیدی نظر اختیار کرتے ہوئے شاعر کے اندرون تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

"عزیز بھارتی کے شعری مجموعہ" چشم معتبر" کا تنقیدی جائزہ یوں لیتے ہیں۔

"ایسے اہلِ قلم جو اپنی زندگی کے خدوخال کی ترتیب و تزئین میں مخلصانہ اور دیانتدارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اُنہیں اپنی شخصیت اور فنکارانہ حیثیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں مایوسی نہیں ہوتی۔ معاشرہ میں سانس لینے والے ایسے دانشوروں کا ایک ایک لمحہ حیاتِ جاوداں کی بشارت دیتا ہے۔"

اپنے کچھ شاعر و ادیب دوستوں کے بارے میں جو تمہیدی جملے لکھے ہیں ملاحظہ ہوں۔

"ڈاکٹر صادق نقوی میرے اُن اولین شاعر دوستوں میں سے ایک ہیں جن کی دلنواز شخصیت کے گہرے نقوش آج بھی میرے دل پر اسی طرح مرتسم ہیں جس طرح پہلی ملاقات کے موقع پر تھے۔ شہر کے مختلف کالجوں اور جامعہ عثمانیہ کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا وہ پُراثر ماحول کاش ایسا آئے جو لوٹا سکے۔" (ڈاکٹر صادق نقوی)

"کسی سے دوستی کرنا اور نبھانا انسانی زندگی کا ایک غیر معمولی کارنامہ سمجھتا ہوں رئیس اختر کو میں نے ہر مرحلہ پر با اعتماد بہترین دوست پایا۔ رئیس اختر کی وضع داری قابل رشک ہے۔ نرم گفتاری، سبک خرامی، مزاج کی شگفتگی، انداز گفتگو، طرز تکلم اور خاص طور پر صاف گوئی ہر ملاقاتی کو بے حد متاثر کرتی ہے۔" (رئیس اختر)

"یہ ممکن ہے کہ انسان سب کچھ بھول جائے مگر اُن اولین ساعتوں کو نہیں بھول سکتا جن کا دوستی و روابط کی اولین محسوسات سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ فیض الحسن خیال سے میری دوستی عمر کے اُس حصہ میں ہوئی جب شعور کی منزل، راستوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مستقل مزاج راہ رو کی منتظر رہا کرتی ہے" (فیض الحسن خیال)

"معاشرے میں پھیلے ہوئے انسان، زندگی کے مختلف تقاضوں کے رشتوں میں بندھے ہوتے ہیں۔ لیکن اُن میں سے کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے خود بہ خود رسم و راہ بڑھانے کو جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایسے کچھ لوگوں سے جو پہلی نظر میں اچھے لگتے ہوں اُن سے دوستی کی جائے۔" (نام کرنولی)

"رحمٰن جامی کا تعلق بھی ایسے ہی ایک قبیلہ سے ہے جس کے تیور، تلوار کی تیز دھار اور جس کی گفتگو پُر خلوص لب و لہجہ کی بے ساختگی اور والہانہ پن کی ضمانت دیتے ہیں۔ رحمٰن جامی سے میری دوستی کی اساس شعر و ادب کے اُن روز و شب سے تعلق رکھتی ہے جس میں تخلیق کار اپنی مخصوص اولاد کو بھی بہتر سے بہتر شکل و صورت میں دیکھنے کا متمنی رہتا ہے۔" (رحمٰن جامی)

"بعض شخصیتوں میں وضع داری اس حد تک جذب ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے قریب ترین دوستوں کو بھی پوری طرح بے تکلف ہونے نہیں دیتی۔ ممکن ہے کہ حالات کی گرم ہواؤں نے ہمیں جھلسانے کی سازش کی ہو لیکن ہمارے تعلقات کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ ہو سکی چونکہ ہم نے ٹھنڈی چھاؤں، ہلکی ہلکی روشنی اور تازہ تازہ خوشبوؤں کے درمیان اپنی دوستی کی بنیاد رکھی تھی۔" (ڈاکٹر مصطفےٰ کمال)

"میں نے اپنے دوستوں کا جائزہ لیتے ہوئے کبھی یہ نہیں سوچا کہ معاشرہ کی ہر سطح پر کون کس مقام پر ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے صرف یہ دیکھا ہے کہ اُس مخصوص شخص کا مجھ سے کس طرح کا سلوک ہے۔ یوں بھی میں نے ہر دوست کو اُس کے مخصوص رویوں اور اس کے مزاج کی دلکشی کے ساتھ قبول کیا ہے۔" (ڈاکٹر طیب انصاری)

"معاشرے میں یوں تو قابلِ رشک و لائق تحسین بہت سے لوگ مل جائیں گے لیکن ایسے لوگ کم ملیں گے جن کے جینے کا مقصد ہی اپنے لئے کم اور دوسروں کیلئے زیادہ ہو اور جن کے صبح و شام آس پاس کے لوگوں کی بہتر زندگی، اُن کے علمی، ادبی و

فلاحی کاموں کیلئے بادِ صبا کے لہراتے ہوئے آنچل کی طرح معطر ہوں۔" (کنہیا لال سنگھ ورما)

"ذہن پر کافی بار ڈالنے پر بھی یاد نہیں آرہا کہ اکمل حیدرآبادی سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں تیئے شہر کے نوجوان شاعروں میں صرف اور صرف ایک ہی ایسا شاعر تھا جو شاعروں اور تہذیبی پروگرامس کے انعقاد میں دلچسپی لیتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔" (اکمل حیدرآبادی)

"بعض لوگ زندگی کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بھی اپنی شخصیت کے خد و خال کو ظاہر ہونے نہیں دیتے۔ معاشرہ میں ایسے بھی کچھ لوگ پائے جاتے ہیں جو کبھی کبھی ہونے والی ملاقاتوں میں اپنے ظاہر و باطن کو ایک ہی شکل و صورت میں پیش کرتے ہوئے اپنی پاکیٔ کردار اور آئینہ صفت ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔" (مناں منظور)

حیرت ہوتی ہے کہ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود صلاح الدین نیّر اپنے قلم کیلئے اتنا وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں اور پھر یہ کہ اس زود نویسی کے باوجود ان کی تحریریں اپنا معیار قائم رکھتی ہیں اور زبان و بیان کی خوبی کے ساتھ ادبیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ ذخیرۂ الفاظ ان کے یہاں اتنا وافر ہے جو ہر قسم کے اظہار خیال میں ان کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ صلاحیت حاصل ہے ان کے علمی پس منظر اور وسیع مطالعہ کا۔ ان کی تحریر کی اس معقولیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ حقائق اور واقعات کو پیش کرنے میں بڑی صفائی اور راست گوئی سے کام لیا گیا ہے۔ حاشیہ آرائی کہیں نظر نہیں آتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جناب نیّر کی زندگی میں جو وضعداری اور اصول پسندی ہے وہی ان کی تحریروں میں جھلکتی ہے۔ "پھر وہی پرچھائیاں" کے اوراق نے جہاں نیّر کی زندگی کے بہت سارے لمحات کو مجسم کردیا ہے وہیں بہت سی شخصیتیں الفاظ کے پردوں میں محفوظ ہوگئی ہیں۔

علی احمد جلیلی

جلیل منزل۔ حیدرآباد۔
۲۵ رمئی ۱۹۹۳ء

"پھر وہی پرچھائیاں"

مجھے اپنی بہن صالحہ الطاف (مدیر خاتونِ دکن) کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرنے کا ایک اور موقع نصیب ہوا ہے "قافلہ چلتا رہے گا" کی طرح اس کتاب کی ترتیب و تزئین کی ذمہ داری بھی بہ تعاون فاطمہ تاج' صالحہ الطاف نے لی تھی۔ شعر و ادب کی پہلی خوشبو جو آج تک میرے مشامِ جاں کو مہکا رہی ہے وہ صالحہ الطاف کی مرہونِ منت ہے۔ "قافلہ چلتا رہے" کی اشاعت کے بعد صالحہ آپا کی یہ خواہش تھی کہ میں اپنی اُن مختلف تحریروں کو بھی کتابی شکل دوں جو میری فائیلوں میں بند تھیں۔ میری اِس کتاب "پھر وہی پرچھائیاں" کی اشاعت بھی صالحہ الطاف کی شخصی دلچسپی کی آئینہ دار ہے۔ اِس کتاب میں شامل میری بیشتر تحریریں مختلف اوقات میں روزنامہ سیاست میں شائع ہو چکی ہیں۔ سفرنامے' انٹرویوز اور تبصروں کے علاوہ میں نے اپنے چند عزیز ترین شاعر و ادیب دوستوں کے حیات اور کارناموں کو پیش کیا ہے۔ جن کو پڑھنے کے بعد قارئین کو اُن کے فن اور ان کی شخصیت کے وہ تمام پہلو دکھائی دیں گے جو اُن کی زندگی کے خدوخال میں رنگ بھرتے رہے ہیں۔ اِس کتاب میں شامل تحریریں بھی دراصل ایک انتخاب ہیں — میری خود بھی یہ خواہش تھی کہ میں نے تین دہوں پر محیط اپنی شاعرانہ زندگی میں جو کچھ پایا اور کھویا ہے انہیں محفوظ رکھوں۔ اِس کتاب سے پہلے میری منتخب غزلوں کا ضخیم مجموعہ 'سفر جاری ہے' (۱۹۸۸ء) میں منتخب نظموں کا ضخیم مجموعہ "یہ کیسا رشتہ ہے" (۱۹۹۰ء) اور خود نوشت سوانح عمر گزری (۱۹۹۲) شائع ہو چکے ہیں صالحہ الطاف نے ڈاکٹر صابرہ سعید کے تعاون سے "صلاح الدین نیر۔ حیات اور شاعری" کے زیرِ عنوان ممتاز دانشوروں کی تحریروں کو "قافلہ چلتا رہے گا" کے نام سے شائع کیا ہے۔

گلِ تازہ کی منتخبہ غزلوں کا منظوم تلگو ترجمہ "تیر گیتالو" کے نام سے (۱۹۶۵ء)
منظرِ عام پر آچکا ہے۔ خدا کی مہربانی شاملِ حال رہی تو اس کتاب کے بعد بھی کچھ اور
کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ کتابوں کی اشاعت کے معاملے میں، میں اپنے
آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میری اور مجھ سے متعلق تا حال ۱۱ کتابیں شائع ہو چکی
ہیں۔ عظمتِ غزل (عظمت عبد القیوم فن اور شخصیت) اور عظمتِ خیابان (عظمت عبد القیوم)
کی اشاعت بھی میری ادبی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ مجھے اس بات کی طمانیت حاصل ہے کہ میری شعری
و نثری کوششیں اربابِ فکر و فن کی نظروں میں قابلِ اعتنا رہی ہیں چنانچہ میری تمام کتابوں
کو (بجز گلِ تازہ (۱۹۶۵ء) چونکہ اس زمانے میں ملک میں اردو اکیڈیمیوں کا وجود نہیں تھا)
ملک کی مختلف اردو اکیڈیمیوں کی جانب سے انعامات سے نوازا گیا ہے۔ تقریباً ہر کتاب کی
اشاعت کیلئے سرکاری و غیر سرکاری سطح کے علاوہ علمی و ادبی اداروں کی جانب سے گرانٹ ملی ہے۔
جیسا کہ میں نے اپنی بعض تحریروں میں واضح کیا ہے کہ میرے شعری و ادبی پوزیشن کے تعین میں
میری ذاتی صلاحیتوں کے علاوہ ادارۂ سیاست اور خاص طور پر جناب عابد علی خاں اور جناب
محبوب حسین جگر کی مشفقانہ سرپرستی کو بڑا دخل رہا ہے۔ آج بھی میں نے اسی سائبان کے تکیہ پر اعتماد
اور وقار فضا میں اپنے علمی و ادبی سفر کو جاری رکھا ہے۔ فکر و خیال کے اس طویل سفر میں،
میں اُن لوگوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جن کی سانسوں کی خوشبو میرے تن من میں رچ بس گئی ہے
اولین ساعتوں کی مہک کے ساتھ ساتھ دورانِ سفر کے وہ تمام اُجالے اب بھی میرے ساتھ ہیں جو
مجھے ہر لمحہ اپنا سفر جاری رکھنے کی تلقین کیا کرتے ہیں۔ وہ پرچھائیاں بھی میرے ساتھ ساتھ
ہیں جو میرے وجود کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی میری ذات میں ضم ہو چکی ہیں۔ آج کے معاشرہ میں کھل
کر سانس لینا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں پوری سانس لینے کے
موقف میں ہوں۔ میں خدا سے یہی مانگتا ہوں کہ میرا سفر رکنے نہ پائے۔ میں اپنی خودداری،
عزتِ نفس اور وضع داری پر قائم رہوں۔

صلاح الدین نیر

۲۵ مئی ۱۹۹۳ء

دیارِ نبیؐ میں دو ہفتے

جدّہ میں چار سو سالہ جشنِ حیدرآباد تقاریب

ایک خوشگوار دن کی بات ہے کہ جب میں سیاست آفس میں اپنے شعری و ادبی کاموں میں مصروف تھا تو جناب زاہد علی خاں منیجنگ ایڈیٹر سیاست نے جدہ سے آئے ہوئے ایک فون پر گفتگو کے بعد مجھ سے کہا کہ آپ کو جدہ کی چار سو سالہ جشنِ حیدرآباد تقاریب میں شرکت کرنی ہے (جدہ کے بعد ہی مکہ اور مدینہ کا تصور)۔ میں نے یہ سن کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ خانۂ کعبہ کا دیدار، عمرہ کی سعادت اور گنبدِ خضرا کا نظارہ کر سکوں گا۔ ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی کیا نعمت ہو سکتی ہے کہ وہ خانۂ کعبہ کے طواف اور مدینہ منورہ کی زیارت سے فیض یاب ہو۔ میں نے زاہد علی خان سے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے دل ہی دل میں اُن کے لئے دین و دنیا کی نعمتوں اور برکتوں سے سیراب ہونے کی دعائیں کیں۔ قارئینِ سیاست جانتے ہیں کہ جدہ سعودی عرب میں بزمِ اردو جدہ کی جانب سے ۱۴ فروری تا ۲۳ فروری ۱۹۹۱ء دس روزہ جشنِ حیدرآباد تقاریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اِن تقاریب کی صورت گری اور ان کے انعقاد کے سلسلے میں جن سربراہوں اور بے لوث خدمت گذاروں کی دلچسپی کا دخل رہا ہے اُن میں محمد باقر، میر ایوب علی خاں، ڈاکٹر شمس بابر، ضیاء الدین نیر

شریف اسلم، ڈاکٹر سید علی، ڈاکٹر محمد عبدالفیاض، عارف قریشی، سرور عزیز، منہاج الحسن فاروقی، صالح مہدی، حسین علی بن محفوظ، حیات اللہ خاں کے علاوہ دیگر سرگرم عمل کارکنوں میں جناب عروج احمد خاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان تقاریب میں افتتاحیہ اجلاس کے علاوہ مشاعرہ، سہ روزہ کلچرل پروگرام، سمپوزیم، نمائش اور فوڈ فیسٹول شامل تھے۔ ان تقاریب میں شرکت کے لئے حیدرآباد کا پہلا قافلہ ۸ر فبروری کی شب ایر انڈیا کی ڈائرکٹ فلائٹ سے جدہ کے لئے روانہ ہوا جس میں جناب عابد علی خاں مدیر سیاست، سالارِ ملت جناب سلطان صلاح الدین اویسی، مزاح کاروں میں مصطفےٰ علی بیگ، بوگس حیدرآبادی، کمال رضا، عابد علی، منور علی اور دیگر اصحاب شامل تھے۔ جدہ انٹرنیشنل ایرپورٹ پر تقاریب کمیٹی سے وابستہ جن اصحاب کی جانب سے پُرتپاک استقبال کیا گیا، ان میں قابلِ ذکر محمد باقر، ڈاکٹر شمس یاور، میر ایوب علی خاں، شریف اسلم، ڈاکٹر فیاض، ضیاء الدین نیر، ڈاکٹر سید علی اور دیگر اراکین تھے۔ جشن تقاریب کا دوسرا قافلہ ۱۲ر فبروری کی شب ۹ بجے انڈین ایرلائنس سے بمبئی کیلئے روانہ ہوا۔ اس میں جناب نریندر لوتھر، حمایت اللہ، صلاح الدین نیر، طالب خوندمیری، شیخ مولا (سابق پرنسپل انڈین ایمبیسی اسکول جدہ)، علی الدین نوید، صبغتہ اللہ مبارک، گلوکاروں میں فریدالدین، رکن الدین اور خان اطہر شامل تھے۔ بمبئی میں ایک رات ہمیں رکنا پڑا۔ ٹورازم ڈپارٹمنٹ کے نمائندہ کے تعاون سے ہمیں ایک ہوٹل لے جایا گیا۔ دوسرے دن ۱۳ر فبروری کو ہم لوگ ۵ بجے شام کی ایر انڈیا فلائٹ سے ۵ گھنٹوں کا سفر طے کرتے ہوئے ہندوستان کے وقت کے مطابق ۱۰ بجے شب جدہ انٹرنیشنل ایرپورٹ پر اترے۔ بمبئی سے میسر حیدرآباد

مسٹر میر ذوالفقار علی بھی ہمارے ساتھ ہو گئے (وہ دہلی سے بمبئی آئے تھے)۔ جدہ ایرپورٹ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ایرپورٹ سے باہر نکلنے کے لئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگا۔ ہمارے پاس کوئی قابلِ اعتراض سامان نہیں تھا لیکن عرب ممالک کے سخت ترین قوانین کی وجہ سے ہم نے سہمے سہمے اپنا سامان چک کروایا۔ چکنگ کے دوران ہمارے قافلے کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک عرب چکنگ آفیسر نے گلوکار رکن الدین کے پاس ہارمونیم دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ سمجھانے پر وہ سمجھ نہ سکا، پھر بولا بجاکر دکھاؤ۔ رکن الدین نے ہارمونیم بجایا۔ اس کے بعد چکنگ کے طریقۂ کار میں کچھ نرمی آگئی اور ہم سب سلامتی کے ساتھ ایرپورٹ کے احاطہ سے باہر نکل گئے جہاں ہمارے استقبال کے لئے ڈاکٹر شمس بابر، محمد باقر، میر ایوب علی خاں ضیاء الدین نیر، شریف اسلم، ڈاکٹر فیاض، ڈاکٹر سید علی اور دیگر اصحاب موجود تھے۔ وہاں سے جناب نریندر لوتھر اور مجھے ڈاکٹر شمس بابر نے اپنی موٹر میں بٹھالیا۔ اسی طرح دوسرے اراکین نے دیگر شاعروں اور فنکاروں کو ساتھ لے کر شہر کی اس ہوٹل میں آئے جہاں استقبالیہ ترتیب دیا گیا تھا جس کے بعد ڈنر کا بھی اہتمام تھا۔ جب ہم وہاں پہونچے تو ہم نے جناب ہاشم علی اختر اور دیگر مدعوئین کو پایا۔ معلوم ہوا کہ کچھ ہی دیر پہلے جناب عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر چلے گئے۔ پُرتکلف دعوت سے قبل تمام اراکین اور شرکاء سے تعارف کروایا گیا۔ اس وقت ہندوستان کے وقت کے لحاظ سے ایک بج رہا تھا۔ ہندوستان کے وقت سے سعودی عرب جدہ کا وقت ۲½ گھنٹہ آگے ہے۔ ہوٹل پہونچنے کے بعد ہم نے اپنی اپنی گھڑیوں کا ٹائم جدہ کی ٹائمنگ کے مطابق ٹھیک کرلیا۔ ڈنر کے بعد ہمارے قافلہ کے اراکین مختلف میزبانوں کے حوالے کر دئیے گئے

جناب نریندر لوتھر اور جناب رام سوامی کے میزبان ڈاکٹر فیاض تھے۔ حمایت اللہ صاحب شریف اسلم کے ساتھ رہے۔ جناب طالب خوندمیری کو اُن کے ایک دوست اپنے ہمراہ لے گئے۔ صلاح الدین نیّر، علی الدین نوید، اور صبغت اللہ بمیاٹ کی میزبانی جناب عروج احمد خاں کے حصہ میں آئی۔ فرید الدین، رکن الدین اور خان اطہر کو ایک اور رکن اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ بات نہایت ذمہ داری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے میزبانوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ ہم دورانِ قیام جدہ نہایت آرام سے رہے۔ جشن کا افتتاحیہ اجلاس ۱۴ر فبروری کی شب ۹ بجے نہایت اعلیٰ پیمانے پر احاطہ انڈین ایمبیسی اسکول منعقد ہوا، جس کی صدارت جناب صلاح الدین اویسی صدر کل ہند مجلس اتحاد المسلمین نے کی۔ اس اجلاس کو جناب عابد علی خان مدیر سیاست، جناب سید ہاشم علی اختر، میر ذوالفقار علی میئر حیدرآباد، جناب نریندر لوتھر اور جناب طارق غازی چیف ایڈیٹر سعودی گزٹ نے مخاطب کیا۔ جناب رام سوامی نے نظم سنائی۔ جناب عابد علی خان نے سوونیر کی رسم اجرا انجام دی۔ جناب میر ذوالفقار علی اور بلدیہ جدہ کی نمائندگی کرنے والے جناب شیخ مدنی نے چار مینار ماڈل کی نقاب کشائی کی۔ اس موقع پر جناب نریندر لوتھر نے چیف منسٹر آندھرا پردیش ڈاکٹر ایم چناریڈی کا اُردو میں لکھا ہوا پیام پڑھ کر سنایا اور اپنا ایک مضمون " شہزادہ۔ شاعر۔ عاشق معمار" سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ افتتاحیہ اجلاس کے موقع پر جناب نریندر لوتھر نے "حیدرآباد کی جھلکیاں" پر مشتمل نمائش کا افتتاح کیا۔ افتتاحیہ اجلاس میں تقریباً زائد از ڈیڑھ ہزار حیدرآبادی خواتین و حضرات نے شرکت کی (جن میں رنگ برنگی لباس میں ملبوس بچے بھی شامل تھے)۔ خواتین بھی بہترین لباس میں ...

کئے ہوئے تھیں۔ مرد بھی عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھے۔ کئی اصحاب نے شیروانی پہن رکھی تھی، بعض رومی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم جشن تقاریب میں نہیں بلکہ حیدرآباد کی کسی شادی یا چوتھی کی تقریب میں شریک ہیں یا حیدرآبادی تہذیب کی ایک خاص محفل میں ہیں۔ لوگ شاداں و فرحاں تھے۔ ایک دوسرے سے انتہائی خوشگوار ماحول میں مل رہے تھے ہم سے بھی وہاں بے شمار اصحاب نے ملاقات کی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ ہم حیدرآباد ہی میں ہیں۔ جلسے کے اختتام کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک حیدرآبادیوں سے خوشگوار ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مصافحہ کرنے اور بغل گیر ہونے والے حیدرآبادی لوگ محسوس کر رہے تھے کہ ہم اُس سرزمین سے چل کر آئے ہیں جہاں انہوں نے اپنا بچپن اپنی جوانی اور اپنی عمر کا خوشگوار حصہ گذارا ہے۔ وہ ہم سے ٹوٹ ٹوٹ کر مل رہے تھے اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہم اُن کے بھائیوں، اُن کے والدین، اُن کے رشتہ داروں اور اُن کے دوست و احباب کی خوشبو اپنے ساتھ لائے ہیں۔ ہمیں بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہماری آنکھوں میں اُس روشنی، نرمی، ٹھنڈک اور اضطراری کیفیت کو دیکھنا چاہتے ہیں جو اُن کی وطن سے جدائی کے وقت اُن کے والدین کی آنکھوں میں دکھائی دی تھی۔ ہم سے بار بار شہر کی اُن گلیوں کا حال جاننا چاہتے ہیں، جہاں انہوں نے اپنے بچپن کے لاقیمت لمحے گذارے ہیں۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ جب وہ اپنے وطن لوٹیں گے تو کیا انہیں وہ سب کچھ ملے گا جو وہاں چھوڑ کر آئے تھے اور جو کچھ انہیں یہاں میسر ہے وہاں ملے گا۔ وہ کچھ دیر کے لئے مایوس بھی ہو جاتے تھے۔ پھر اُن کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک اور اُن کے چہروں پر شگفتگی کی لہر دوڑ

جاتی تھی۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ جب ہم شہر لوٹیں گے تو اُن گلیوں کو سلام کہنا جہاں ہم نے اپنا بچپن بتایا ہے۔ اُن لوگوں کو بھی ہمارا سلام کہنا جن سے ہمارا کسی نہ کسی طرح کا ایک درد کا رشتہ ہے اور اُن لوگوں کو بھی جن کی یادوں نے ہمیں ہنسنے اور رونے کا سلیقہ سکھایا اور آخر میں اُن لوگوں کو بھی سلام کہنا جن کی سانسوں کی خوشبو ہماری سانسوں میں تحلیل ہو گئی ہے اور جن کی جدائی کا ایک ایک لمحہ کئی برسوں کا سفر طے کر رہا ہے۔ افتتاحیہ اجلاس کا آغاز ۹ بجے شب ہوا لیکن جلسہ گاہ تقریباً ڈیڑھ بجے شب تک خالی نہ ہو سکا۔ افتتاحیہ اجلاس کے دوسرے دن (۱۵ ر فبروری) کی شب انڈین ایمبیسی اسکول کے آڈیٹوریم میں مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس کی صدارت جناب عابد علی خاں نے کی۔ اس مشاعرہ میں صرف حیدرآباد کے ہی مہمان اور میزبان شاعروں نے کلام سنایا جن میں حیدرآباد سے آئے ہوئے شاعروں میں نریندر لوتھر، حمایت اللہ، صلاح الدین نیرؔ، مصطفےٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، علی الدین نویدؔ، رام سوامی، برگس حیدرآبادی، صبغتہ اللہ بمباٹ، منور علی مختصرؔ، کے علاوہ جدہ اور ریاض میں مقیم حیدرآبادی شعراء اعتماد صدیقی، بیکس نواز شارقؔ، مصلح الدین سعدی، رؤف گلشن، رشید الدین رشید، مہتاب قدر، عبدالوہاب (عارف ممتاز) آغا سروش، سہیل حیدری، عثمان علی یحییٰ، عبدالمقتدر رفیق احمد اشک اور منور النساء منورؔ نے کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ جناب ضیاء الدین نیرؔ نے خیر مقدمی اور تعارفی تقریر کی اور شکریہ ادا کیا۔ مشاعرہ میں خواتین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ سامعین نے دل کھول کر شعراء کو داد و تحسین سے نوازا۔ شہ نشین پر جناب محبوب حسین جگر کے علاوہ ڈاکٹر شمس بابر، محمد باقر، شریف اسلم، حمایت اللہ،

عارف قریشی، میر ایوب علی خاں اور دیگر اصحاب موجود تھے۔ افتتاحیہ اجلاس سے دن کھویر تقاریب جناب محمد باقر میرے ہاں آئے اور کہنے لگے کہ عابد علی خاں نے یاد فرمایا ہے اور ابھی آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ میں فی الفور ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ جناب عابد علی خاں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے جب میں وہاں پہونچا تو عابد علی خاں صاحب اور محترم جگر صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سب سے پہلے جگر صاحب نے دریافت کیا کہ زاہد علی خاں کیسے ہیں آفس کا کیا حال ہے۔ شنکرجی مشاعرہ کے انتظامات کی تیاریوں اور مہمان شعراء کی قطعی فہرست کیا ہے۔ جب میں نے سیاست کے بارے میں تفصیل بتلاتے ہوئے کہا کہ زاہد علی خاں صاحب نہایت سکون و اطمینان، خوش اسلوبی اور خوشگوار انداز میں کام دیکھ رہے ہیں تو جگر صاحب اور عابد علی خاں صاحب کے چہرہ پر ایک پُر سکون خوشی کی جھلک دکھائی دی۔ پھر حیدرآباد کے حالات پر گفتگو رہی، چائے نوشی کے بعد باقر صاحب مجھے اپنے ہمراہ لے گئے۔ اُس ملاقات کے بعد میں جب بھی عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب سے ملنا چاہا، معلوم ہوا کہ یا تو وہ عمرہ کے لئے تشریف لے گئے ہیں یا مدینہ منورہ گئے ہوئے ہیں۔ مشاعرہ کے دوسرے دن ہمارے میزبان عروج احمد خاں کے ہمراہ ہم (صلاح الدین نیرؔ، علی الدین نویدؔ، صبغتہ اللہ یمیاط) عمرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ احرام باندھنے کے بعد ہم میں ایک عجیب فرحت بخش ایمانی، جذباتی اور عقیدت مندی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ہم نے جدہ سے مکہ معظمہ کا سفر ایک گھنٹہ میں طے کیا۔ خانۂ کعبہ میں داخل ہونے سے قبل جب عالیشان مسجد الحرام پر ہماری نظر پڑی تو ہماری آنکھوں میں

روشنی کی ایک لہر دوڑ گئی، جب ہماری نظریں خانۂ کعبہ پر پڑیں تو بے اختیار آنسو نکل پڑے اور یوں محسوس ہوا کہ کوئی طاقت ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔
ہم نے دیکھا کہ دنیا بھر کے ملکوں سے آئے ہوئے ہزاروں مسلمان طوافِ کعبہ میں دیوانہ وار مشغول ہیں۔ ہم نے اپنے ہاتھ اُٹھا کر خانہ کعبہ کا طواف شروع کیا اور اِس بات کی کوشش کی کہ ہر چکر میں حجرِ اسود کا بوسہ لیں۔ یوں بھی حجرِ اسود تک پہونچنا آسان نہ تھا۔ پھر ہم نے آنسوؤں کے سیلاب میں حجرِ اسود کا بوسہ لیا۔ یہ ایسا مقام ہے جہاں خود بہ خود پلکیں بھیگ جاتی ہیں۔ گناہوں کی معافی کے لئے اور دعاؤں کا ایک سلسلۂ لامتناہی شروع ہو جاتا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اکثر لوگ طواف کی دعائیں پڑھتے پڑھتے بے اختیار آنسو بہاتے ہیں۔ طواف کے بعد ہم نے مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی، اِس کے بعد آبِ زم زم پینے کے لئے زم زم شریف آئے اور خوب پیٹ بھر کر زم زم پیا۔
وہاں سے ہم سعی کے لئے صفا، مروہ کی طرف چلے گئے۔ صفا، مروہ کو اب سنگِ مرمر سے آراستہ کیا گیا ہے۔ سعی کے سات چکر لگانے کے بعد ہمارا عمرہ ختم ہوا۔ اِس طرح مجھے دورانِ قیامِ جدہ تین دفعہ عمرہ کا شرف حاصل ہوا ہے۔ تیسری دفعہ شبِ معراج کے موقع پر میرے بہترین دوست، مخلص ترین انسان، مجسمِ اخلاق و مروت جناب سید کرامت علی مجھے عمرہ کے لئے لے گئے۔ اُس رات کرامت علی نے مجھے احاطہ مسجد الحرام میں وہ مقام بھی بتلایا جہاں سے جبرئیل علیہ السلام، مولائے کائنات کے پاس آئے، آپ کا سینہ شق کیا اور اُس کو آبِ زم زم سے دھویا۔ کرامت علی نے وہ جگہ بھی دکھلائی جہاں رسالت مآب کی ولادتِ باسعادت ہوئی تھی، خانہ کعبہ

میں شبِ معراج کی نورانی گھڑیاں فیضان و برکات کا دریا بہا رہی تھیں۔ مکہ معظمہ کی نورانی کیفیات سے گذرنے کے بعد ہماری آنکھیں گنبدِ خضرا کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہوگئیں۔ مدینہ کا ذرہ ذرہ اور اس کے صبح و شام میں جو جمالیاتی کیفیات چھائی ہوئی ہیں اُن کے اظہار کے لئے قلم عاجز ہے۔ ایک سیدھے سادے مسلمان کے دل پر خانہ کعبہ کی کیفیت کا کچھ اور ہی اثر ہوتا ہے اور گنبدِ خضرا کے نظارہ کی کیفیت کچھ اور ہی کیف و سرور بخشتی ہے۔

مدینہ کے سفر میں حمایت بھائی (حمایت اللہ) ہمارے میرِ کارواں تھے اُن کی قیادت میں ہمیں ہر قسم کا آرام رہا۔ تقاریب کے جو انتظامی کنوینر میر ایوب علی خاں نے ازراہِ عنایت انڈین ایمبیسی کے تعاون سے ایک آرام دہ ویان کا انتظام کیا تھا۔ اُنھوں نے اور حیات اللہ خاں وائس پرنسپل انڈین ایمبیسی اسکول جدہ نے ۱۱ بجے صبح ہمیں خدا حافظ کہا۔ جدہ مکہ مدینہ کا فاصلہ ذریعہ موٹر تقریباً ۴½ گھنٹہ کا ہے۔ دورانِ سفر ہم نے ایک پاکستانی ہوٹل میں لنچ کیا۔ لنچ سے پہلے ایک مسجد میں ہم نے نمازِ ظہر پڑھی۔ بمبئی کے متوطن پابندِ صوم و صلوٰۃ ہمارے ڈرائیور نے امامت کی۔ جب ہم مدینہ منورہ کے قریب پہونچ رہے تھے تو ہم سب کی نظریں فرطِ اشتیاق سے گنبدِ خضرا کو دیکھنے کیلئے بے چین تھیں۔ جیسے جیسے مدینہ قریب آتا گیا، ہم تمام ایک خاص قسم کی رقت آمیز فضاء میں ڈوب گئے۔ مدینہ میں ہمارے لئے انڈین ایمبیسی کے گیسٹ ہاؤز میں ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہمارے قدم والہانہ طور پر روضۂ مطہرہ کی زیارت کے لئے بڑھنے لگے۔ جب ہماری نظر گنبدِ خضرا پر پڑی

تو اس نعمتِ غیر مترقبہ پر ہم نے پروردگار کا لاکھ لاکھ بار شکریہ ادا کیا کہ ربّ العزت نے آج ہمیں یہ مبارک دن بھی دکھلایا۔ جب ہم روضۂ مبارک میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وسیع و عریض مسجدِ نبوی میں ہزاروں مسلمان تلاوتِ قرآن پاک میں مصروف ہیں، ہم بھی اُن مسلمانوں میں شامل ہوگئے۔ اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان ہم نے روضۂ مبارک کی جالی کے سامنے کھڑے ہوکر سلام عرض کیا اور حضور صلعم سے شفاعت کی درخواست کرتے رہے۔ ہم نے خانۂ کعبہ اور روضۂ مبارک کے حضور وہ سب کچھ مانگا جس کے بعد کچھ اور مانگنے اور چاہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مدینہ میں ہم نے ایک رات اور ایک دن کا زائد از نصف وقت گذارا۔ روضۂ مبارکؐ سے بالکل قریب جنت البقیع ہے جہاں ہم نے ہزاروں صحابہ کرامؓ کی آخری آرام گاہ دیکھیں۔ تمام قبریں مٹی کی ہیں۔ یہاں ہمیں بتلایا گیا کہ حضرت عثمانِ غنیؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت فاطمہؓ کی آرام گاہیں یہیں ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ کیسے کیسے نایاب خزانے جنت البقیع میں دفن ہیں۔

جشن تقاریب کے آخری دن کی سرگرمیاں فوڈ فیسٹول پر مشتمل تھیں۔ فوڈ فیسٹول سے قبل ایک کلچرل پروگرام پیش کیا گیا۔ اس آخری اجلاس میں تقاریب کمیٹی کے عہدہ داروں، اراکین اور مہمان و میزبان شاعروں اور فنکاروں کو سفیر ہند برائے سعودی عرب جناب عشرت عزیز کے ہاتھوں تحائف دیئے گئے۔ ان کلچرل پروگرامس میں جدہ میں مقیم ممتاز گلوکار مسٹر سکندر علی اور مقصود یاور زبیر نے اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا۔ مشہور

طبلہ نواز احمد خان نے اپنے فن کا جادو جگایا۔ دورانِ قیام جدہ، حلقۂ اربابِ ذوق جدہ کی جانب سے حیدرآباد کے شاعروں کے اعزاز میں ۱۹ر فبروری کی شب دربار ہوٹل میں مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس کی صدارت صلاح الدین نیر نے کی، ایک اور معیاری مشاعرہ بزمِ عثمانیہ جدہ کی جانب سے ۲۷ر فبروری کو ایشین کارنر ہوٹل میں حیدرآبادی شاعروں کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا جس کی صدارت جناب ضیاء الدین نیر نے کی جبکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے صلاح الدین نیر نے شرکت کی۔ اس مشاعرہ کو خواجہ کمال الدین اور جناب عارف قریشی نے بھی مخاطب کیا۔ بزمِ عثمانیہ جدہ کی جانب سے حیدرآباد کے شاعروں کو تحائف دیئے گئے۔ جدہ کے قیام کے دوران شاعروں اور مزاح کاروں کے اعزاز میں کچھ اور مقامات پر محفلیں آراستہ کی گئیں تھیں۔ یہ تمام شاعر و فنکار مختلف اوقات میں اپنے شہر لوٹے۔ جب ہم اپنے شہر پہونچے تو ہمیں وہ صبح و شام ملے جنھیں ہم، چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ۔۔

سیاست ۱۹۹۰ء

جدّہ میں ۸ دن

(طوافِ خانہ کعبہ، سعی، زیارتِ گنبدِ خضرا اور عالمی مشاعرہ)

جدّہ کے عالمی مشاعرہ میں حیدرآباد سے روانگی سے دو روز قبل جس وقت میری ایک منہ بولی بہن شمشاد نے امامِ ضامن باندھا تو اُسی وقت سے میرا ذہنی سفر شروع ہوا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے مشاعرہ ہی کے سلسلے میں دوسری مرتبہ بھی طوافِ کعبہ (مکّہ) اور دربارِ رسالتِ مآب (مدینہ) میں حاضری دینے کا موقع ملا۔

انڈیا ویلفیر سوسائٹی جدّہ کے صدر جناب عارف قریشی (حیدرآبادی) نے اپنے پہلے خط مورخہ ۲ر مارچ ۱۹۹۲ء کے ذریعہ نہ صرف مجھے بلکہ حیدرآباد کے دو ممتاز شعراء امیر احمد خسرو اور رئیس اختر کو بھی مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دی تو عارف قریشی کے لئے میرے دل سے دعائیں نکلیں کہ اس بہانے سرزمینِ پاک کی فضاؤں میں مجھے دوسری مرتبہ سانس لینے کا موقع ملنے والا ہے۔ یہ مشاعرہ دراصل ۲۴ر ستمبر کو ہونے والا تھا لیکن جدّہ میں ۲۲ر اکتوبر کو انڈو پاک مشاعرہ کے اعلان نے انہیں اپنا مشاعرہ ملتوی کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اس لئے کہ اتنی کم مدت کے درمیان ایک ہی شہر میں دو مشاعروں کے انعقاد سے دونوں مشاعروں پر بُرا اثر پڑنے

کا امکان تھا۔

عارف قریشی نے پاسپورٹ، ویزا اڈرس کرواتے کی ذمہ داری مجھے سونپی اور مجھ سے خواہش کی کہ میں ہندوستان میں اُن کی نمائندگی کروں۔ چنانچہ میں نے شعراء سے ربط قائم رکھا۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اِس مشاعرہ میں حیدرآباد کے تین شعراء امیر احمد خسرو، صلاح الدین نیر اور رئیس اختر کے علاوہ ملک کی دیگر ریاستوں سے خمار بارہ بنکوی، حفیظ میرٹھی وغیرہ اور دوحہ قطر سے جلیل نظامی اور جدہ میں مقیم شعراء فرید الوحیدی، الاستاد صلاح حمدی الیادر، محمد سالم العید روس نے شرکت کی۔ ثقلین حیدر ناظم مشاعرہ تھے۔ جب مشاعرہ کی قطعی تاریخ (۱۳؍ دسمبر) کا تعین ہوا تو عارف قریشی کے خطوط کا تانتا بندھا رہا۔ وقتاً فوقتاً اُن کے ٹرنک کال بھی ملتے رہے۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے عابد علی خاں مدیر سیاست، محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست اور زاہد علی خاں منیجنگ ایڈیٹر سیاست اور ریاستی وزیر محمد جانی کو مدعو کیا گیا تھا۔ عابد علی خاں صاحب کی مسلسل علالت کی وجہ سے محبوب حسین جگر اور زاہد علی خاں نے شرکت سے معذرت چاہی۔ محمد جانی نے بھی شرکت نہیں۔ ایسی صورت میں مجھ سے خواہش کی گئی کہ میں کسی ممتاز شخصیت کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کروں۔ اتفاق سے اُن دنوں استقبالیہ کمیٹی کے رکن محمد مظہر الدین التمش، حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ میں نے کافی غور و خوض کے بعد جسٹس سردار علی خاں کا نام تجویز کیا۔ مظہر الدین التمش نے میرے انتخاب کی داد دی۔ دوسرے دن صبح میں نے سردار علی خاں کو فون پر شرکت کی دعوت دی۔ انھوں نے بے انتہا مسرت کا اظہار کرتے ہوئے شرکت کا تیقن دیا۔ یہ مشاعرہ جدہ کی شعری و ادبی تاریخ میں اپنی نوعیت اور کامیابی کے اعتبار سے ہمیشہ یاد رہے گا۔

مشاعرہ میں اہلِ ذوق خواتین و حضرات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ تمام شاعروں کا کلام توجہ سے سنا گیا اور ہر شاعر کو بھرپور داد و تحسین سے نوازا گیا۔ مشاعرہ میں حیدرآبادی سامعین کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ یہ بات نوٹ کی گئی کہ جب حیدرآبادی شاعروں کو شہ نشین پر بلایا گیا تو پُرجوش تالیوں کی گونج میں ان کا استقبال کیا گیا۔ حیدرآبادیوں نے اپنے اس عمل سے اپنے شہر کے شاعروں کی توقیر میں اضافہ کیا۔

جب مشاعرہ کے انعقاد کی پہلی خبر یکم نومبر کے سیاست میں شائع ہوئی تو خاص طور پر عزیز و اقارب اور میرے قریبی احباب میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ مشاعرہ سے دو ہفتہ قبل ہی سے خبروں اور اشتہارات کے ذریعہ مشاعرہ کی تشہیر کی جانے لگی۔ جدہ کو روانگی سے قبل عزیز و اقارب کے علاوہ میرے قریبی دوستوں مثلاً منظور عزیز بھارتی، رحمٰن جامی، صادق نوید اور مومن خاں شوق نے میری اور رئیس اختر کی گلپوشی کی۔ (شائد گل پوشی اس لئے بھی کی گئی کہ ہمیں طوافِ خانۂ کعبہ اور زیارتِ گنبدِ خضرا کا ایک خوشگوار موقع نصیب ہو رہا ہے)۔

ہم (سردار علی خاں، رئیس اختر، صلاح الدین نیّر) شہرِ محبت کو خدا حافظ کہتے ہوئے ۲۹ نومبر کو سہ پہر بذریعۂ طیارہ بمبئی روانہ ہوئے۔ پروگرام کے مطابق بمبئی ایرپورٹ پر مسٹر شمیم سرپرست انڈیا ویلفیر سوسائٹی کے نمائندہ، آفتاب احمد ہمارے منتظر تھے۔ ہم تینوں کو شمیم صاحب کے مکان لے جایا گیا جہاں ہم سے پہلے دیگر مدعو شعراء موجود تھے۔ ہمیں طے شدہ پروگرام کے مطابق ۳۰ نومبر کو جدہ پہنچ جانا چاہیئے تھا لیکن سعودی کونسلیٹ آفس بمبئی میں پاسپورٹ انڈارس نہ ہونے کی وجہ سے دو دن تاخیر سے یعنی ۲ ڈسمبر کو جدہ کے لئے روانہ ہوئے۔

ایر انڈیا کے ذریعہ ۱/۲ ۵ گھنٹہ کا سفر طے کرتے ہوئے ہندوستان کے وقت کے مطابق ۴ بجے جدہ پہونچے۔ (ہندوستان اور جدہ میں ۱/۲ ۲ گھنٹہ کا فرق ہے) یعنی اگر ہندوستان میں ۴ بجے ہوں تو جدہ میں ۱/۲ ۱ بجے کا ٹائم ہوگا۔ جدہ ایرپورٹ پر سوسائٹی کے عہدہ داروں، عارف قریشی، ضیاء الدین نیرؔ، معین خاں، مظہر الدین التمش، سید محی الدین علی عظمت، ناظم الدین مقبول، مرزا اسمٰعیل بیگ، عظیم خاں فلکی اور دیگر منتظمین نے ہمارا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ ہم لوگ الگ الگ موٹروں کے ذریعہ ہوٹل دارالحجاز پہنچے۔ مشاعرہ کے دن شام تک ہوٹل میں رہے۔

۳ر ڈسمبر کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر جدہ کی سب سے بڑے آڈیٹوریم دارالحنان میں عالمی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جناب ادریس دہلوی مدیر شمع نے صدارت کی۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے ممتاز قانون داں جسٹس سردار علی خان (ریٹائرڈ چیف جسٹس آندھراپردیش ہائی کورٹ)، قونصل جنرل ہند برائے سعودی عرب جناب سید محمد یسٰین ندیم، ڈاکٹر زین العابدین ڈائرکٹر برائے ادارۂ مسلم اقلیتی اُمور لندن نے شرکت کی۔ ڈاکٹر عبداللہ سحر نصیب سکریٹری جنرل مسلم ورلڈ لیگ نے جدہ میں مقیم حیدرآبادی ممتاز شاعر جناب ناظم الدین مقبول کے ترتیب دیئے ہوئے سوونیر کی رسم اجراء انجام دی۔ جناب عارف قریشی مدیر سوونیر نے پہلی کاپی حاصل کی۔ مشاعرہ میں مہمان و میزبان شاعروں کو بھرپور داد و تحسین سے نوازا گیا۔ مشاعرہ میں خاص طور پر یہ بات نوٹ کی گئی کہ جب حیدرآباد کے شاعروں کو شہ نشین پر بلایا گیا تو حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے سامعین نے فرطِ مسرت میں کافی دیر تک تالیوں کی گونج میں

خیر مقدم کیا۔ مشاعرہ میں کلام سنانے سے پہلے اور بعد میں بھی تالیاں بجائی گئیں۔ مشاعرہ میں حیدرآبادی خواتین و حضرات کی کثیر تعداد نے شرکت کی (خواتین کیلئے پردہ میں علحدہ نشستوں کا انتظام تھا)۔ باذوق سامعین نے تمام شاعروں کو توجہ اور دلچسپی سے سنا۔ آغازِ مشاعرہ ہی سے اختتام مشاعرہ تک مشاعرہ کی خوشگوار فضا برقرار رہی۔ سرپرست سوسائٹی جناب ضیاء الدین نیر نے نہایت عمدگی سے مشاعرہ کی ابتدائی کاروائی چلائی۔ شعراء کا استقبال کیا۔ معتمد سوسائٹی جناب علیم فلکی نے پروگرام کی تفصیل بتلائی۔ جسٹس سردار علی خان، ادریس دہلوی، سید محمد یسٰین ندیم، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیب نے مخاطب کیا۔ صدر سوسائٹی اور مشاعرہ کے روح رواں عارف قریشی نے تعارفی و خیر مقدمی تقریر کی۔ جناب ثقلین حیدر نے خوش اسلوبی کے ساتھ نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ ضیاء الدین نیر اور عارف قریشی نے اظہار تشکر کیا۔ مشاعرہ سے قبل اور مشاعرہ کے بعد بہت سے حیدرآبادیوں سے ملاقات رہی جن میں ڈاکٹر شمس بابر، سعید محسن باعبال، ناظم الدین مقبول، محمد باقر، شریف اسلم اور محترمہ سلیم اشرف قابل ذکر ہیں۔ مشاعرہ کے بعد بیشتر حیدرآبادیوں نے لنچ اور عشائیہ پر مدعو کرنا شروع کیا۔ عارف قریشی، مظہر الدین التمش، مسز شمیم، معین نواز خان، ڈاکٹر شمس بابر، طارق امیر احمد خسرو، اور ضیاء الدین نیر نے پُرتکلف دعوتیں دیں۔ شریف اسلم، محمد باقر، ناظم الدین مقبول اور محترمہ سلیم اشرف نے تحفے دیئے۔ مشاعرے کے دوسرے دن جناب شمیم نے تمام مہمانوں کو لنچ پر مدعو کیا۔ لنچ کے بعد ہم تمام شاعروں کو مختلف منتظمین کے ہاں ٹھہرایا گیا۔ ہمارے میزبان مظہر الدین التمش تھے جن کے ہاں ہم (سردار علی خاں

صلاح الدین نیر، رئیس اختر) ۴؍ڈسمبر کی شام سے حیدرآباد واپس ہونے تک یعنی ۹؍ڈسمبر تک مقیم رہے۔ مظہر الدین التمش کے علاوہ ان کے تینوں بھائی رئیس، مجاہد اور حمید نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہماری میزبانی کی اور ہمیں محسوس ہی ہونے نہیں دیا کہ ہم اُن کے مہمان ہیں۔ پروگرام کے مطابق یکم ڈسمبر کو مکہ شریف اور ۲؍ڈسمبر کو مدینہ منورہ کو جانا طے پایا تھا لیکن ویزے کے اندراس میں تاخیر کی وجہ سے دو روز بعد یعنی ۲؍ڈسمبر کو ہم جدہ پہنچے تھے۔ ۳؍ڈسمبر کی شب عارف قریشی اور ان کے ایک ساتھی سید محی الدین علی عظمت نے مجھے اور رئیس اختر کو عمرہ کرایا۔

مجھے عمرہ کی یہ دوسری سعادت حاصل ہوئی۔ پہلی بار ۱۹۹۱ء میں حیدرآباد کے (۴۰۰) سالہ جشن تقاریب کے مشاعرہ میں شرکت کے لئے حاضر ہوا تھا۔ جیسے ہی مسجد الحرام کی پُر نور میناروں پر نظر پڑی، فرطِ مسرت سے پلکیں بھیگ گئیں اور یوں محسوس ہونے لگا کہ کوئی غائبانہ طاقت ہے جو خانۂ کعبہ کی طرف کھینچ رہی ہے۔ جب خانۂ کعبہ دکھائی دیا تو دل کی کیفیت ہی بدل گئی۔ اسی عالم میں طواف کرتا رہا اور ہر بار حجرِ اسود کو بوسہ دیتا رہا۔ طواف کے بعد جب ملتزم تک پہنچا تو دیر تک خانۂ کعبہ سے لپٹا رہا۔ خدا سے جو کچھ مانگنا تھا مانگ لیا۔ سعی اور دیگر اُمور کی تکمیل کے بعد ہم رات دیر گئے جدہ لوٹے۔ ۵؍ڈسمبر کو دن بھر گھر میں رہے ہمارے میزبان التمش صاحب نے پُر تکلف عشائیہ دیا۔ شب کو حسبِ پروگرام میرے اخبار سیاست کے ساتھی بہترین دوست سید کرامت علی نے جو امریکن کونسلیٹ میں اچھی خدمت پر فائز ہیں، عمرہ کے لئے لے گئے (جدہ سے مکہ تک کا سفر

ایک گھنٹہ میں طے ہوتا ہے)۔ جب مکہ شریف کی سرحد شروع ہوئی تو ایک عجیب سرشاری کی کیفیت دل پر چھائی رہتی ہے۔ میں اور رئیس اختر عمرہ کے بعد ۵ بجے صبح اپنی قیامگاہ لوٹے۔

۶؍ ڈسمبر کو میں اور رئیس اختر ذریعہ ٹکسی کار مدینہ روانہ ہو گئے۔ (جدہ سے مدینہ منورہ کا فاصلہ ۵ گھنٹوں میں طے ہوا) مسجد نبوی کی توسیع کی وجہ سے ہمیں کافی فاصلہ پر چھوڑ دیا گیا۔ وہاں سے ہم دونوں فرطِ عقیدت و احترام کے ساتھ درودِ شریف پڑھتے ہوئے دربارِ رسول پاک صلعم میں پہنچ گئے۔ جب گنبدِ خضرا آنکھوں میں بس گیا تو دل و نگاہ کی کیفیت ہی بدل گئی۔ دربارِ مصطفویؐ میں حاضر ہونے کے بعد ہم بھی دیگر غلامانِ نبی صلعم کی صف میں بیٹھ گئے۔ عصر اور مغرب کی نماز مسجد نبویؐ میں پڑھی۔ مغرب کی نماز کے بعد بادیدۂ نم گنبدِ خضری پر وداعی نظریں ڈالتے ہوئے احاطۂ مسجد نبوی سے باہر نکل گئے۔ جب ہم دربارِ رسولؐ سے لوٹ رہے تھے تو ایک صاحب نے جو ہندوستانی معلوم ہو رہے تھے ہم سے کہا کہ بابری مسجد شہید کر دی گئی ہے۔ یہ سن کر زبردست دھکا لگا، دل و دماغ ماؤف ہو گئے۔ سنبھلنے کافی دیر لگی۔ ایک ٹکسی لی مدینہ شریف کے قابلِ ذکر مساجد مسجدِ قبا، مسجد قبلتین میں نماز نفل پڑھی۔ حضرت امیر حمزہؓ کی زیارت کی اور دیگر مقاماتِ مقدسہ کے دیدار کے بعد جدہ روانہ ہونے کے لئے ٹکسی کی تلاش میں نکل گئے۔

جدہ کو واپسی کے لئے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے (۸۰) ریال کرایہ کی بات کی۔ مدینہ سے کوئی (۲۰) کیلومیٹر دور ایک پٹرول پمپ پر ٹکسی رک گئی۔ مزید دیڑھ سو ریال

نے لیے ٹاسی ڈرائیور نے تکرار شروع۔ ہم نے ڈرائیور کے مشتبہ رویہ کی وجہ سے
ٹاسی چھوڑدی۔ ہماری گفتگو سُن کر ہندوستانی باشندے خورشید اعظم اور اُن
کے ۳ ساتھی اپنے کمرہ سے نیچے اُتر آئے اور مسئلہ کی نوعیت دیکھ کر ہم سے کہا کہ
ہم اُن کے ہاں رُک جائیں اور کہا کہ صبح واپسی کا انتظام کیا جائے گا۔ خورشید اعظم
اپنے ہمراہ ہمیں اپنے کمرہ میں لے گئے۔ خورشید اعظم اس تمام احاطہ کے الکٹرک
انجینئر ہیں۔ انہوں نے ہمارے کھانے کا انتظام کیا۔ ہمارے لئے دو پلنگ کا انتظام کیا
اور خود زمین پر چادر بچھا کر سو گئے۔ خورشید اعظم نے دورانِ گفتگو کہا کہ وہ شاعر
ہیں چنانچہ ہم نے اُن سے دو غزلیں سنیں اور میں اور رئیس اختر نے بھی ایک ایک غزل
سنائی۔ ہم صبح ۱/۲ ۷ بجے گہری نیند کے بعد بیدار ہوگئے۔ خورشید اعظم نے ہم سبھوں
کے لئے ناشتہ تیار کیا۔ چائے نوشی کے دوران ٹکسی کا انتظام ہوگیا۔ ایک سو ریال
کرایہ پر ہم دونوں ۱/۲ ۹ بجے جدہ کے لئے روانہ ہوکر ۱/۲ ۱۱ بجے پہنچے۔ جدہ پہنچ کر
خسرو بھائی (امیر احمد خسرو) کو فون کیا۔ کچھ ہی دیر بعد واثق خسرو اپنی کار لے کر آگئے
اور ہمیں اپنے ہمراہ اپنے گھر لے گئے۔ چائے نوشی کے کچھ دیر بعد ہم اپنے میزبان
کے گھر چلے گئے۔ ڈاکٹر شمس بابر کی والدہ محترمہ سلیم اشرف کی یہ خواہش تھی کہ
ایک شام ہم اُن کے دولت کدہ پر عشائیہ میں شریک رہیں۔ ہم نے اُن کے ہاں صرف
چائے پی۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد خسرو بھائی کے ہاں چلے گئے۔ عارف قریشی کے
ہمراہ یہ فاصلہ طے ہوا۔ خسرو بھائی منتظر تھے۔ خسرو بھائی کے لڑکوں نے پرتکلف
عشائیہ دیا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد ہم اپنی رہائش گاہ پہنچے۔ ۱۵ منٹ توقف کے
بعد جناب رئیس اختر کے سمدھی جناب عثمان شریف اکاؤنٹنٹ سعودی ایرلائینس

کے ہمراہ ہم دونوں تیسری دفعہ عمرہ کے لئے روانہ ہوگئے ۔ ہم اُس رات احاطۂ خانۂ کعبہ میں ۱۲ بجے سے صبح ۴ بجے تک رہے ۔ جدہ میں قیام کے آخری دن یعنی 9 ڈسمبر کی شام ۴۵-۹ پر بمبئی کے لئے ہماری فلائٹ تھی ۔ ضیاء الدین نیر نے اشرفیہ کی ایک ہوٹل میں تمام مہمانوں کو لنچ دیا ۔ لنچ کے بعد مظہر الدین التمش اور اُن کے بھائی رئیس اور مجاہد کے ہمراہ ہم (جسٹس سردار علی خاں، رئیس اختر، نیر) ایرپورٹ پہنچے ۔ ایرپورٹ پر ہمیں خدا حافظ کہنے کے لئے شریف اسلم اور عارف قریشی بھی آئے تھے ۔ شریف اسلم نے ہمیں کچھ اور تحائف سے نوازا ۔ چائے پلائی اور کچھ لطیفے سنائے ۔ ہم ۴۵ - ۶ کو گلف ایر سے دوحہ قطر روانہ ہوئے اور وہاں سے ½ ۱۱ بجے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے ۔ جب ہم بمبئی پہنچے تو ہندوستان کے وقت کے لحاظ سے ۵ بج رہے تھے ۔ ایرپورٹ کی ضروری فارملٹیز کے بعد ہم ۷ بجے صبح ڈومسٹک ایرپورٹ پہنچے ۔ جب ہم ڈومسٹک ایرپورٹ پہنچے تو یہ معلوم ہوا کہ پائیلٹس کی ہڑتال شروع ہوچکی ہے اور کئی پروازیں منسوخ ہوچکی ہیں ۔ ہماری سیٹ کنفرم نہیں تھی ۔ ایرپورٹ کے ذمہ داروں نے بتایا کہ ویٹنگ لسٹ ختم ہونے کے بعد ہی پوزیشن کے بارے میں بتایا جائیگا، ویسے سیٹ ملنا مشکل ہے ۔ لیکن ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے کئی مسافروں نے اپنا سفر ملتوی کردیا تھا جس کی وجہ سے ہمیں ۴۵ - ۱ کی فلائٹ ملی ۔ اور ہم ایک گھنٹہ کی مسافت طے کر کے حیدرآباد پہنچے ۔ جیسے ہی ہم نے اپنی سرزمین پر پہلا قدم رکھا، یوں محسوس ہوا کہ سارے سفر کی تھکن دور ہوچکی ہے، شہرِ محبت کی مٹی ہمارے تن من کو مہکارہی ہے اور پھر اُن ہی فضاؤں میں لوٹ آئے جہاں کے صبح و شام بے نام رشتوں کی طرح ہماری زندگی کے ایک ایک لمحہ سے اپنائیت مانگ رہے تھے

-۰-

(سیاست ۱۹۹۲ء)

دوحہ قطر میں ۵ دن

اُردو مشاعروں کی مقبولیت اور افادیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ مشاعرے جہاں زبان و ادب کی خدمت کا ذریعہ ہیں وہیں تہذیبی جشن کی ایک روشن علامت بھی سمجھے جاتے ہیں۔ مشاعروں کی مقبولیت کا اب تو یہ عالم ہے کہ اُردو مشاعرے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک میں بھی اپنی انفرادیت کا لوہا منوا رہے ہیں۔ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ، کناڈا، لندن، سعودی عرب اور خلیجی ممالک میں اسی اہتمام کے ساتھ منعقد کئے جا رہے ہیں جس طرح کہ ہندوستان و پاکستان کے شہروں میں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تارکانِ وطن نہ صرف اپنی زبان و تہذیب کا تحفظ چاہتے ہیں بلکہ اپنے ورثے کی حیاتت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ لوگ مشاعروں میں بڑے ہی اعتماد کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ ہر اُس ملک میں جہاں اُردو کا چلن ہے وہاں کے رہنے بسنے والے حتی الامکان اپنی مادری زبان ہی میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں۔ کچھ مہینے پہلے کی بات ہے کہ اُردو مرکز دوحہ قطر کے روح رواں محمد سلیمان دلہوی

کا مجھے ایک خط ملا جو گذشتہ ۳ سال سے دوحہ قطر میں اپنے رفقائے کار کے تعاون سے عالی شان پیمانے پر مشاعرے منعقد کر رہے ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ گذشتہ دو سال سے زیر اہتمام انڈو قطر اُردو مرکز، سالانہ نوعیت کے مشاعرے منعقد کئے جا رہے ہیں، لیکن افسوس یہ رہا کہ اُن دونوں ہی گذشتہ مشاعروں میں حیدرآباد دکن جیسے اُردو کے شہر کی نمائندگی نہ ہوسکی، جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اراکینِ مرکز میں سے کسی کو حیدرآباد کے موجودہ نامور شعرائے کرام کے پتے معلوم نہ تھے اور اتفاق سے مرکز کے اراکین میں جو اصحاب حیدرآباد کی نمائندگی کے فرائض ادا کر رہے تھے اُن کا اولاً تو تعلق ایسے طبقہ سے نہ تھا جو شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہوں اور جو اُردو زبان، شاعری و ثقافت کا فہم و ادراک اس طرح رکھتے ہوں کہ اپنے ہی شہر کے معتبر اور معروف شعراء کے بارے میں اُن کو معلوم ہو سکے اور بار بار اس طرف دھیان دلانے سے بھی وہ مرکز کے دونوں مشاعروں میں حیدرآباد دکن سے نمائندہ شعراء کو مدعو کرنے سے قاصر رہے اور عمومی تاثر حیدرآباد کے اُردو داں طبقہ میں یہ قائم ہوا کہ مرکز، حیدرآباد کے شعراء کو مدعو نہیں کرتا بلکہ مرکز کے اہم اراکین میں یوپی، بہار، دہلی، مہاراشٹرا، کرناٹک اور حیدرآباد کی نمائندگی کرنے والے موجود تھے۔ لہٰذا حیدرآباد کی نمائندگی کرنے والے اصحاب کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ مشاعرہ کی تنظیمی کمیٹی کو حیدرآباد کے شعراء کے پتے فراہم کرتے اور اُن کو مدعو کرنے میں مدد و مشورہ دیتے۔ الغرض اس سال نمائندگی میں تبدیلی ہوگئی ہے اور حیدرآباد دکن کے یہاں قطر میں خوش گلو اور معتبر شاعر جناب جلیل احمد نظامی نے نمائندگی سنبھالی اور آپ کا نام نامی ۱۷ رفروری ۱۹۸۹ء

کے دن منعقد ہونے والے مشاعرہ کے لئے تجویز کیا ہے۔ اس مشاعرہ میں برصغیر ہند و پاک کے اہم اور معتبر ترین شعرائے کرام کو مدعو کیا جاتا طے پایا ہے جن میں آپ کا نام نامی بھی شامل ہے۔"

اس خط کے کچھ ہی دن بعد سفیر ہند برائے دوحہ قطر جناب سریندر لال ملک گمنام نے سفیر ہند کی حیثیت سے مجھ سے پُرزور خواہش کی کہ میں بھی اس مشاعرہ میں کسی طرح شرکت کروں۔ اس خط کے بعد میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر مشاعرہ میں شرکت کے لئے تیار کر لیا۔

۱۶ر فروری کی شام جیسے ہی بمبئی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ 'سہارا' پہونچا تو وہاں شعراء کے قافلے میں سب سے پہلے میری نظر پاکستان کے ممتاز شاعر حمایت علی شاعر پر پڑی۔ حمایت علی شاعر نے مجھے دیکھتے ہی کہا کیا تم بھی چل رہے ہو" میں نے برجستہ کہا" کیا مجھے نہیں چلنا چاہیئے۔ قدرے رُک کر حمایت علی شاعر نے مسکراتے ہوئے یہ تاثر دیا کہ دکن سے بھی ایک شاعر کی شرکت سے انہیں مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ اس قافلہ میں دلی کی فلائٹ سے آئے ہوئے شاعروں میں حمایت علی شاعر کے علاوہ حفیظ میرٹھی، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر ملک زادہ منظور، منور ہاشمی (پاکستان)، وسیم بریلوی، گلزار دہلوی، محمد علی سوز، اظہر عنایتی، منظر بھوپالی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر بعد علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی ایرپورٹ پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم تمام شاعر ایرانڈیا کی فلائٹ سے دوحہ قطر کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارا جہاز بحرین سے ہوتا ہوا دوحہ قطر پہونچا۔ ایرپورٹ پر ہم شاعروں کے استقبال کے لئے سفیر ہند جناب سریندر لال ملک گمنام کے علاوہ اُردو مرکز کے عہدہ داران واراکین موجود تھے۔

ہم شاعروں کا بڑی ہی گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا، اور ہمیں ایک خصوصی کار کے ذریعہ V.I.P کی انتظار گاہ میں لے جایا گیا جہاں ہماری ملاقات اُردو مرکز کے دیگر اراکین سے بھی ہوئی۔ ہم تمام شاعروں کو وہاں کی روایت کے پیشِ نظر قہوہ پیش کیا گیا۔ یہاں سے ہم شاعروں کو دوحہ قطر کی مشہور ترین ہوٹل شیرٹان لے جایا گیا، جہاں ہمارا قیام ۱۹ ارفروری کی شام تک رہا۔ منتظمین مشاعرہ نے ہم سے فرداً فرداً خواہش کی کہ کوئی شاعر، مشاعرہ سے قبل ہوٹل سے کہیں باہر نہ جائے تاکہ تازہ دم رہ کر شعراء اطمینان کے ساتھ اپنا بہترین سے بہترین کلام سنا سکیں۔ مشاعرہ کے دن (۱۷ ارفروری) کو جمعہ تھا، مجھے بھی اُس سرزمین پر سجدہ ریز ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مشاعرہ کی شام سفیرِ ہند نے اپنی قیام گاہ پر ایک پُراثر تعارفی تقریب کا اہتمام کیا تھا جس میں دوحہ قطر کے اعلیٰ عہدہ دار اور ممتاز شخصیتیں موجود تھیں سفیرِ ہند کی پر تکلف ضیافت کے بعد تمام شعراء کو مختلف کاروں کے ذریعہ شہر کی مشہور ترین ہوٹل شیرٹن ہوٹل المجلس (مشاعرہ گاہ) لے جایا گیا۔ مشاعرہ گاہ نہایت اہتمام کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔ جب ہم شہ نشیں پر پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ ہر شاعر کی نشست مختص کی گئی ہے اور تکیہ پر ہر شاعر کا خوش خطی کے ساتھ نام لکھا گیا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے میری نشست جناب علی سردار جعفری کے بازو ہی تھی۔

دوحہ قطر میں یہ انڈو پاک مشاعرہ امیرِ دولتِ قطر شیخ خلیفہ بن حمد آل ثانی کے ۱۷ ویں یومِ جلوس کے موقع پر اور پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے صد سالہ جشنِ سالگرہ کی مناسبت سے انڈو قطر اُردو مرکز کی جانب سے منعقد ہوا تھا جس کی صدارت سفیرِ ہند برائے قطر جناب سریندر ملک گمنام نے کی جبکہ وزیر صحت

و سماجی اُمور جناب علی بن احمد الانصاری نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ بعد ازیں جناب اصغر نقوی مصطفےٰ آبادی نے تعارفی اور محترمہ یاتو سلیمان نے خیر مقدمی تقریر کی۔ اِس موقع پر سفیرِ ہند نے اپنی تقریر میں اُردو زبان، اُردو شعر و ادب اور اُردو تہذیب کو ملک کا ایک عظیم ورثہ و عظیم سرمایہ قرار دیا۔ مہمانِ خصوصی جناب علی بن احمد الانصاری نے بھی مخاطب کیا۔ صدر مشاعرہ سریندر ملک گمنام کے علاوہ مشاعرہ میں انڈو پاک کے نمائندہ شعراء مسرز علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، حمایت علی شاعر (پاکستان)، حفیظ میرٹھی، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، وسیم بریلوی، ڈاکٹر ملک زادہ منظور، صلاح الدین نیّر، گلزار دہلوی، منور ہاشمی (پاکستان)، محمد علی موج، نیاز گلبرگوی (پاکستان)، اطہر عنایتی، منظر بھوپالی، آفتاب لکھنوی، عیسیٰ تشتری کے علاوہ میزبان شعراء مسرز جلیل نظامی، اصغر نقوی اور باسط نقوی نے اپنا منتخبہ کلام سنا کر زبردست داد و تحسین حاصل کی۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی۔ مشاعرہ میں سفیرِ پاکستان جناب غلام حنیف اور سفیر بنگلہ دیش جناب محمد فضل الرحمٰن نے بھی شرکت کی۔ اِس یادگار مشاعرہ میں خواتین و حضرات کی کثیر تعداد نے شرکت کی اور تمام شاعروں کو بھرپور داد و تحسین سے نوازا۔ ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ہندوستان ہی کے کسی بڑے مشاعرہ میں شریک ہیں۔ سامعین کی داد و تحسین کے انداز سے ہمیں اپنے ملک کے کامیاب مشاعرے یاد آرہے تھے۔ سامعین کے لئے نشستوں کا انتظام کرسیوں پر تھا ڈائس پر آرام دہ فرش بچھایا گیا تھا۔ مشاعرہ کی خوشگوار فضاء دیکھ کر بار بار ہمیں ہمارے شہر کے ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی کے مشاعرے یاد آرہے تھے۔

جس طرح ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی مشاعرہ کے اہتمام میں انتظامی طور پر بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی اسی طرح اس مشاعرہ کے منتظمین نے بھی اپنے سلیقے کا ثبوت دیا۔ یہ مشاعرہ ½ ۸ بجے شب شروع ہوا اور کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچا۔ مشاعرہ کا صرف ایک دور ہوا۔ اس مشاعرہ میں ایک خاص بات یہ دیکھی گئی کہ بعض شاعروں نے اپنی کوئی غزل مکمل نہیں سنائی، بلکہ اپنی غزلوں کے متفرق شعر سنا کر مشاعرہ کو طوالت دیتے رہے۔ مشاعرہ کے دوسرے دن سفیرِ ہند کے فرسٹ سکریٹری جناب جعفری نے مہمان شعراء کو لنچ پر مدعو کیا۔ سفیرِ ہند کے علاوہ شہر کی بعض ممتاز شخصیتیں بھی موجود تھیں۔ اس شب دوحہ قطر کی ادب نواز ہر دل عزیز شخصیت جناب عبود بن محفوظ نے اپنی شاندار کوٹھی میں اعلیٰ پیمانے پر مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں مہمان و میزبان شعراء نے اپنے بہترین کلام سے نوازا۔ مشاعرہ کی صدارت جناب علی سردار جعفری نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ملک زادہ منظور نے انجام دیئے۔ اس خوشگوار اور معطر محفلِ شعر و سخن میں دوحہ قطر کی نمائندہ شخصیتوں نے شرکت کی۔ مشاعرہ کے بعد پُرتکلف عشائیہ دیا گیا اور اس موقع پر جناب عبود بن محفوظ نے تمام شعراء کو کیسۂ زر کی شکل میں اعزاز سے نوازا۔

۱۹ر فروری کو اُردو سروس (ریڈیو) دوحہ قطر کی جانب سے مدعو شعراء کا مشاعرہ ہوا۔ جناب علی سردار جعفری نے صدارت کی۔ جناب حمایت علی شاعر نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی۔ ۱۷ر فروری کے انڈو پاک مشاعرہ کے کامیاب انعقاد کا سہرا بلاشبہ جناب محمد سلیمان دہلوی کے سر جاتا ہے۔ ان کے خاص معاونین جلیل نظامی، اصغر نقوی اور دیگر اراکین کی دلچسپی کو بھی کافی دخل رہا۔ ہمیں بتایا گیا کہ دوحہ قطر میں

ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی کثیر تعداد ہے۔ یہاں ہر ملک کے لوگ روزگار کی تلاش میں آکر بس گئے ہیں۔ یہاں حیدرآبادیوں کی بھی کثیر تعداد ہے۔ یہاں کی عمارتیں نہایت خوبصورت ہیں۔ شہر کی فضاء نہایت خوشگوار ہے۔ یہاں اس قدر موٹریں ہیں کہ کوئی بھی شخص ہمیں سڑک پر دکھائی نہیں دیا۔ صرف شاپنگ سنٹر پر لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ قطر ایک ایسا مقام ہے جہاں کے بازاروں میں ہر قسم کی اشیاء دستیاب ہیں۔ چونکہ یہاں ہر چیز ارزاں ہے اس لئے یہاں سے واپس ہونے والا ہر شخص بہت کچھ ساز و سامان اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک کے اصل باشندے ۱۶، ۱۷ فی صد ہیں۔ یہاں کے تقریباً تمام لوگ اردو زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ ہمیں یہاں جن جن سے بھی گفتگو کا موقع ملا یوں محسوس ہوا کہ ہم اپنے ملک میں ہیں۔ ان کا رہن سہن، ان کی گفتگو بالکل ہم جیسی ہے۔ بعض اصحاب جو ۲۵، ۳۰ سال سے وہاں مقیم ہیں ان کے لب و لہجہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مشاعرہ میں حیدرآبادیوں کی شرکت قابل لحاظ رہی۔ جب میں مشاعرہ گاہ سے باہر نکلا تو کئی حیدرآبادی مجھ سے ملے، اپنا تعارف کروایا۔ انھوں نے اپنے محلوں کا نام بتلایا۔ بعض حیدرآبادیوں کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ شائد انہیں مجھ میں اپنے والدین، اپنے بھائی نظر آرہے ہوں۔ میں نے بہت سے حیدرآبادیوں سے مل کر یہ محسوس کیا کہ انھیں یہاں سب کچھ آرام و آسائش میسر ہے لیکن وہ اپنے وطن کی یاد کو کبھی اپنے دل سے جدا نہیں رکھتے۔ ایک حیدرآبادی صاحب جو مجھ سے ملنے آئے تھے میں نے حیدرآباد کا تذکرہ کیا تو وہ گم صم ہو گئے، یوں محسوس ہوا کہ

اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں اور ضبط کئے جا رہے ہیں، وہ مجھے تکتے ہی رہ گئے، جیسے اُن کی تمام یادیں میرے چہرے پر جم گئی ہوں۔ اُردو مرکز کی جانب سے یہ تیسرا مشاعرہ تھا۔ میں نے منتظمین مشاعرہ کو مشورہ دیا کہ آئندہ سال ہونے والے مشاعرہ میں حیدرآبادی شاعروں کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی ہونی چاہیئے۔ ویسے بھی دوحہ قطر میں حیدرآبادیوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے بعض حیدرآبادی اِس موقف میں ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو تنہا مشاعرہ کا بار اُٹھا سکتے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو صرف حیدرآباد کے شاعروں کا ایک علحدہ مشاعرہ منعقد کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ بھی بتلایا گیا کہ اِن مشاعروں میں سب سے زیادہ سرمایہ حیدرآبادیوں کا شامل رہتا ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ بعض شعراء ہر سال منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کر رہے ہیں، بعض شعراء کو ذو، دو دفعہ اِن مشاعروں میں مدعو کیا گیا ہے، مختلف وجوہات کی بناء پر۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اُردو مرکز کے اراکین ہر ریاست کے شعراء کا تناسب بھی رکھیں، اِس لئے کہ ہندوستان کی ہر ریاست میں کئی ایسے اعلیٰ درجہ کے شاعر موجود ہیں جو وسائل نہ ہونے کی وجہ سے اہم مشاعروں میں مدعو نہیں کئے جاتے۔ شاعروں کے انتخاب میں اِس بات کا بھی خیال رکھا جانا چاہیئے کہ ایسے شاعروں کو مدعو کیا جائے جو مشاعروں کی روایت کی پاسداری بھی کرتے ہوں۔ دوحہ قطر میں پاکستانیوں کی بھی ایک علحدہ ادبی انجمن ہے۔ اُردو مرکز سے وابستہ رہتے ہوئے اگر حیدرآبادی لوگ بھی اپنی شناخت کے لئے کوئی ایک علحدہ ادبی انجمن بنالیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ اِس مقصد کے لئے دوحہ قطر میں مقیم حیدرآباد کی ایک

ادب نواز شخصیت جناب عبود بن محفوظ کی سرپرستی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اُردو مرکز والوں نے ۱۶ر تا ۱۹ر فروری شعراء کو مہمان رکھا۔ تمام شعراء (سوائے حفیظ میرٹھی، صلاح الدین نیر اور منور ہاشمی) ۱۹ر فروری کی شام ہندوستان لوٹے۔ منور ہاشمی ۲۰ر فروری کو پاکستان چلے گئے۔ حفیظ میرٹھی دو دن کے لئے اپنے کسی عزیز کے ہاں چلے گئے اور میں اپنے بھانجہ صمد خاں جو ایک انڈین اسکول میں پیشہ درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور اپنے لڑکے شمس الدین عارف جو ایک کمپنی میں منیجر ہے، کے ہمراہ اُن کے گھر گیا۔ دو دن قیام کے بعد ۲۱ر فروری کو شام کی فلائٹ سے بمبئی پہونچا۔ جب میں بمبئی ایرپورٹ پہونچا تو اُس وقت رات کے ۳ بج رہے تھے۔ دیگر مسافروں کے ہمراہ مجھے بھی ایر انڈیا والوں نے بمبئی کی فائیو اسٹار ہوٹل سینٹور میں ٹھہرایا۔ ۲۲ر فروری کی شام کی فلائٹ سے میں حیدرآباد ایرپورٹ پہونچا۔ اپنی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی میں یوں محسوس ہوا کہ ایک سفر ختم ہوا اور دوسرا سفر جاری ہے۔ سچ ہے خوشبو کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

--

۱۹۸۸ء

سیاست

کویت میں تین دن

محسوس ہوا کہ ہمارا سفر شروع ہو چکا ہے، جب ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں کویت میں ہونے والے (۴۰۰) سالہ جشنِ حیدرآباد تقاریب میں شرکت کرنی ہے ہم نے ایر انڈیا فلائٹ کے پہلے زینے پر قدم رکھا تو ہمیں یہ محسوس ہوا کہ ہم سے اپنے گھر کی دہلیز چھوٹی جارہی ہے لیکن اس کے باوجود زمین سے ہمارا رشتہ ٹوٹا نہیں۔ یادوں کا ایک سلسلۂ لامتناہی زندگی کی حرارت کی طرح ہمارے ساتھ تھا ہمیں یہ یاد دلانے کے لئے کہ فضاؤں میں اڑتے ہوئے رہنے سے آسمان سے زمین کا رشتہ ختم نہیں ہوتا۔

کویت میں ۱۷ اور ۱۸ مئی ۱۹۹۰ء کو (۴۰۰) سالہ جشنِ حیدرآباد تقاریب (مشاعرہ اور کلچرل پروگرام) کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تمام عرب ممالک میں مشترکہ خصوصیات کے باوجود ہر ملک اور ہر شہر کی اپنی ایک شناخت بھی ہوتی ہے۔ جشنِ حیدرآباد جدہ کی کیفیت کچھ اور تھی اور جشنِ حیدرآباد ریاض کی کچھ اور۔ جدہ اور ریاض میں جشنِ حیدرآباد کے اخراجات کی ذمہ داری اجتماعی تھی لیکن کویت میں جشنِ حیدرآباد صرف اور صرف جناب ہوشدار خاں کی تنہا مالی ذمہ داری اور شخصی دلچسپی کی وجہ سے منعقد ہوا۔ اگرچہ کہ اُن کے رفقائے کار نے بھی اس پروگرام کی پیش کشی کے سلسلے میں اُن کا ہاتھ بٹایا۔ خان برادرس (محمد ہوشدار خان، محمد شاہین حسین خان، محمد مظہر الدین خان

محمد شہاب الدین خان) کویت میں بڑی عزت، قدر واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ۱۶؍ مئی کی صبح جب میں اور ڈاکٹر موہن لال نگم بیگم پیٹ ایرپورٹ پہونچے تو ہم سے پہلے وہاں جناب عابد علی خاں، حمایت اللہ، مصطفےٰ علی بیگ، وٹھل راؤ دولت رام اور ہوشدار خاں کے نمائندہ خالد یعقوب موجود تھے۔ عابد علی خاں صاحب کو خدا حافظ کہنے کے لئے جناب محبوب حسین جگر اور جناب زاہد علی خاں آئے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم پر عابد علی خاں کی نظر پڑی اُن کے چہرہ پر ایک خوشگوار مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہمارا ہوائی جہاز بمبئی کے لئے ۱/۲ ۶ بجے صبح پرواز کرتے ہوئے ۱/۲ ۷ بجے صبح بمبئی ایرپورٹ پر اُترا۔ چونکہ کویت کے لئے روانہ ہونے والے پلین کا وقت ۱/۲ ۸ بجے شب تھا۔ اس لئے ہمیں ایر انڈیا سے وابستہ فائیو اسٹار سینٹور ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ جناب ہوشدار خاں کے ایک دوست اور بزنس پارٹنر جناب اسلم نے اپنے گھر پر پُر تکلف لنچ دیا۔ ظہرانہ کے بعد ہم اپنی ہوٹل لوٹ آئے۔ پھر ۶ بجے شام انٹرنیشنل سہارا ایرپورٹ بمبئی کی طرف چل پڑے۔ جہاں ہماری ملاقات جناب سلطان صلاح الدین اویسی، میر ذوالفقار علی، حضرت آغا داؤد ابوالعلائی، عبدالمنعم (حاجی سیٹھ) اور جناب غوث محی الدین خواہ مخواہ سے ہوئی جو کویت کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ کویت کے لئے ہمارا طیارہ ۱/۲ ۸ بجے شب بمبئی سے اُڑا، اور ۱/۲ ۳ گھنٹہ کی مسافت طے کر کے ۱۲ بجے کویت ایرپورٹ پر اُترا۔ کویت ایرپورٹ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اُس وقت وہاں ۱/۲ ۹ بج رہے تھے۔ کویت کا وقت ہندوستان کے وقت کے لحاظ سے ۱/۲ ۲ گھنٹہ کم ہے۔ طیران گاہ پر ہمارا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ خیر مقدم کرنے والوں میں جناب ہوشدار خان چیرمن تقاریب سکندر زماں کے علاوہ

کویت کے مختلف محکموں میں کام کرنے والے حیدرآبادیوں نے ظہرانہ کا انتظام کیا تھا۔ یہ حضرات باب الداخلہ سے جناب صلاح الدین اویسی کو جلوس کی شکل میں جلسہ گاہ لے آئے۔ سالارِ ملت کی گل پوشی کی گئی۔ جناب صلاح الدین اویسی نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ یہاں اتحاد و اتفاق سے رہیں اور اپنے وطن اور شہر کے وقار کو برقرار رکھیں۔ ایک بہت بڑے تخت پر (دستر خوان) ظہرانہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس دستر خوان پر زائد از (۵۰) خورد و نوش کی اشیاء موجود تھیں۔ زائد از (۵۰) افراد نے بہ یک وقت ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھایا۔ یہاں بھی متعدد تصویریں لی گئیں۔ مہمانوں کی ضیافت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی گئی۔ رات ۸½ بجے غزل اور کلچرل پروگرام کا اہتمام آئس اسکیٹنگ رنک آڈیٹوریم میں کیا گیا تھا جس کی صدارت جناب عابد علی خاں مدیر سیاست نے کی جبکہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے جناب سلطان صلاح الدین اویسی اور ڈاکٹر موہن لال نگم نے شرکت کی۔ جناب سلطان صلاح الدین اویسی کے علاوہ سفیر ہند برائے کویت جناب ارون کمار بدھی راجہ نے مخاطب کیا۔ اس موقع پر جناب زاہد علی خاں مینجنگ ایڈیٹر سیاست کی جانب سے روانہ کردہ چار مینار ماڈل کا نہایت خوبصورت مومنٹو، جناب عابد علی خاں نے جناب ہوشدار خاں موسس تقاریب کی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا۔ اس موقع پر جناب ہوشدار خاں نے جناب عابد علی خاں اور جناب زاہد علی خاں سے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے کہا کہ کویت کی جشن تقاریب کے سلسلے میں بنیادی کام اور خدو خال کی صورت گری کے لئے ان دونوں شخصیتوں کی مشاورت ہمیں قدم قدم پر حاصل رہی۔ ہم نے اپنے کام کا آغاز دفتر سیاست سے ہی شروع کیا۔ جس

امداد سے اخبار سیاست نے ہم سے تعاون کیا ہے اس سے ہمارے حوصلے بڑھے ہم نے پروگرام اور جشن کے تمام پر جو کچھ کیا' اپنے شہر کی محبت میں کیا ہے۔ انہوں نے اس موقع پر کہا کہ آندھرا پردیش کے طوفان و باد و باراں کی وجہ سے جو تباہی آئی ہے ہم تمام حیدرآبادی ان تمام خاندانوں کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔ امداد کے طور پر انہوں نے (۵۰) ہزار روپیے کا اعلان کیا۔ کلچرل پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر شکیل خان نے کلچرل پروگرام کی کاروائی چلائی۔ پروگرام میں مہمان و میزبان فنکاروں نے اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا۔ جناب وٹھل راؤ اور اقبال قریشی حیدرآبادی نے اساتذہ سخن کی غزلوں کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کر کے داد و تحسین حاصل کی۔ مزاح کاروں دولت رام اور حمید رشید نے بھی اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے داد حاصل کی۔ کلچرل پروگرام کی کاروائی جناب حمایت اللہ اور مصطفےٰ علی بیگ نے چلائی اور مزاحیہ خاکے پیش کئے اور داد و تحسین حاصل کی۔ سابق میئر حیدرآباد مسٹر ذوالفقار علی نے بھی فلمی گانے سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ ایک ممتاز گلوکار مجیب اللہ مکرم نے بھی خوب رنگ جمایا۔ انور پرویز اور دیگر فنکاروں نے بھی محفل کو متاثر کیا۔ پروگرام میں خواتین و حضرات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ بلا تخصیص مذہب و ملت اصحاب نے اپنی شرکت سے محفل کو کامیاب بنانے میں تعاون کیا۔ مشاعرہ ہو کہ کلچرل پروگرام دونوں تقاریب میں نہایت خوشگوار اور عطر آمیز ماحول بنا دیا۔ آداب محفل' شائستہ روایات اور ادبی ذوق کا مکمل ثبوت دیا گیا۔ اس محفل میں حیدرآباد کے مہمانوں اور شعراء کی بے شمار تصویریں لی گئیں۔ عکس کشی کا سلسلہ محفل کے اختتام کے بعد بھی چلتا رہا۔ مشاعرہ

اور کلچرل پروگرام کے اختتام کے بعد حیدر آبادی بلا تکلف، بے ساختہ ہم سب سے ملتے رہے۔ یوں محسوس ہوا کہ ہم حیدر آباد ہی میں ہیں۔ مشاعرہ سننے اور کلچرل پروگرام سے لطف اندوز ہونے کا وہی انداز تھا جو کئی برس پہلے حیدر آباد کی محفلوں میں رہا کرتا تھا۔

اِن دنوں کویت میں سخت گرمی ہے۔ صبح سے شام تک لُو چلتی رہی، وہاں کی ہر موٹر کار ایرکنڈیشنڈ ہے۔ سارے شہر میں موٹریں ہی موٹریں دکھائی دیتی ہیں۔ پیدل چلنے والے کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ کویت ایک خوبصورت شہر ہے۔ خوبصورت مسجدیں، عالیشان عمارتیں، پاک وصاف سڑکیں، روشنی سے منور سارے ماحول سے ذہنی اور جسمانی تھکن دور ہو جاتی ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ تقاریب کے موسس و اسپانسر جناب ہوشدار خاں انتہائی کم گو، نرم گفتار، شائستہ، معتبر، ہمدرد، باوقار، نفیس اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ کویت میں مقیم حیدر آبادیوں کی ہر ممکنہ مدد کرتے ہیں۔ اُن سے حیدر آبادیوں کو بے حد خلوص ہے اس پروگرام کو کامیاب بنانے والوں میں اُن کے رفقائے کار سکندر زماں، ڈاکٹر معین الدین مستوزئی، احتشام الدین، ابو مجاہد زکی الدین، نصیر الدین، فصیح الدین، محمد مرتضیٰ شیخ، ڈاکٹر ایم اے۔ شاہد، اصغر پرویز، افضل قریشی، ڈاکٹر سمیع خاں، محمد مکرم خاں اور حبیب اللہ مکرم شامل ہیں۔

۱۹ مئی کو جناب ہوشدار خاں نے ایک فائیو اسٹار (کانٹیننٹل ہوٹل) میں مہمانوں کو لنچ دیا۔ میں کویت کی فلائٹ سے ۹ ½ بجے شب بمبئی کے لئے روانہ ہوا۔ ہندوستان کے وقت کے لحاظ سے ۵ ½ بجے صبح بمبئی پہنچا حیدر آباد کا پلین ۱۲ ½ بجے تھا۔ پلین لیٹ نکلا۔ دوپہر کو ۱ ½ بجے بیگم پیٹ

ہوائی اڈہ پر پہونچا - جب میں نے اپنے وطن عزیز پہنچ کر پہلی سانس لی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ خوشبو کا سفر جاری ہے۔ اور میں اُسی پیار، محبت کی فضاؤں میں آگیا ہوں جہاں ہمارے اسلاف کی خوشبو ہمیں احساس دلاتی رہتی ہے کہ جب تک جیتا ہے اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے ساتھ جیتے رہو اور اپنی پہچان کو بہرحال باقی رکھو۔

--

۱۹۹۰ء
سیاست

ایک باکمال شاعر ایک اچھا دوست

رئیس اختر

کسی سے دوستی کرنا اور نبھانا انسانی رشتوں کا ایک اہم کارنامہ سمجھتا ہوں زندگی کے مختلف مراحل پر مختلف حالات سے انسان گذرتا رہتا ہے۔ دوستی کی راہوں میں کچھ ایسے موڑ بھی آتے ہیں جن سے با اعتماد فضا میں سلیقہ سے گذرجانا بھی ایک غیر معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ رئیس اختر کو میں نے روابط کے ہر مرحلہ پر ایک بہترین اور با اعتماد دوست پایا ہے۔

رئیس اختر سے میری پہلی ملاقات میاں مشک ہاسٹل حیدرآباد میں میرے آفس کے ایک ساتھی جناب علیم الدین (اسسٹنٹ سکریٹری) کے توسط سے ہوئی علیم صاحب نے یہ کہتے ہوئے تعارف کروایا کہ رئیس اختر بہت ہی اچھے شاعر ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی کے ذہین طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس تعارف کے بعد رئیس اختر سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہی۔ اُن دنوں حیدرآباد اور اضلاع میں آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ہر ضلع میں کئی ادبی انجمنیں کام کرتی تھیں "دیارِ ادب" کے نام سے ضلع بیدر میں ایک ادبی انجمن تھی جس کے صدر رئیس اختر تھے۔ اس انجمن کے زیر انتظام ہر سال لازمی طور پر ایک سالانہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایسا

حیدرآباد کے نامور شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا۔ میں بھی اکثر ان مشاعروں میں مدعو رہتا۔ مشاعروں کی وساطت سے ہی ہماری دوستی کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ دوران دوستی یہ انکشاف بھی ہوا کہ رئیس اختر میری تائری بھابی کے قریبی رشتہ دار ہیں۔

بیدر میں رشید احمد رشید ایک سینئر کہنہ مشق اور زود گو شاعر تھے۔ ابتدائی زمانے میں رئیس اختر، رشید احمد رشید سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے رئیس اختر کے توسط سے ہی رشید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ رئیس اختر اپنے استاد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب ہم دونوں حیدرآباد اور اضلاع کے مشاعروں میں ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے تو رشید صاحب بے حد خوش ہوتے تھے۔

رئیس اختر جب اعلیٰ تعلیم کے لئے حیدرآباد آگئے تو اُن کی ملاقات مشہور شاعر ظفر عالمگیر سے ہوئی۔ ظفر عالمگیر سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ظفر عالمگیر پاکستان چلے جانے کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ظفر عالمگیر جب تک حیدرآباد میں رہے ان کے قریبی دوستوں میں رئیس اختر اور حسن چشتی تھے۔ (حسن چشتی ان دنوں شکاگو (امریکہ) میں مقیم ہیں)، حسن چشتی اُس زمانہ میں ماہنامہ "آکاش" نکالا کرتے تھے۔ رئیس اختر کا کلام پابندی سے اس رسالہ میں شائع ہوتا تھا۔ ظفر عالمگیر کے بعد رئیس اختر نے جناب شاہد صدیقی سے مشورۂ سخن کیا اُن کے بعد خورشید احمد جامی ان کے شعری سفر کے رہبر رہے۔

رئیس اختر میری دوستی کے ابتدائی زمانہ میں مشاعروں میں کم کم ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ میں اس بات کے لئے کوشاں رہتا کہ رئیس ہر مشاعرہ میں میرے ساتھ رہیں۔

فیض الحسن خیالؔ، رئیس اختر اور میں اکثر مشاعروں میں ایک ساتھ شرکت کرتے۔ رئیسؔ اختر جہاں ایک بلند پایہ کے شاعر ہیں، وہیں ایک مخلص ترین دوست بھی ہیں۔ رئیس اختر کی وضعداری قابلِ رشک ہے۔ ان کی نرم گفتاری، سبک خرامی مزاج کی شائستگی، اندازِ گفتگو، طرزِ تکلم اور خاص طور پر انکی صاف گوئی ہر ملاقاتی کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ تخلص کا اثر رئیسؔ کی شاعرانہ شخصیت پر بھی گہرا دکھائی دیتا ہے۔ رئیسانہ شعر تو کہتے ہی ہیں، آدابِ محفل کی پاسداری میں بھی رئیسؔ اختر اپنی آپ مثال ہیں۔ رئیسؔ اختر کسی بھی دوست کے لئے کسی وقت بھی کوئی مسئلہ نہیں بنے رہے۔ مرنجاں مرنج طبیعت نے بھی ان کو اپنے دوستوں میں امتیازی حیثیت سے نوازا ہے۔ یار باش آدمی ہیں، کھلا ذہن اور کشادہ دل رکھتے ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ کیوں نہ ہو، رئیسؔ اختر نے تحفظِ ذہنی سے کبھی کام نہیں لیا۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، کھُل کر کہہ جاتے ہیں۔

رئیسؔ اختر سے میری دوستی مثالی اور لافانی ہے۔ دوستی کی اس طویل عمر میں ہم میں کسی بھی مرحلہ پر ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔ بے لوث اور بے غرض دوستوں کی طرح ہم دوستانہ روابط کو مزید مستحکم کئے جا رہے ہیں۔ جب کوئی تازہ غزل یا نظم ہوتی ہے تو ہم ایک دوسرے کو سُنا لیتے ہیں، اس کے بعد مشاعروں میں خود اعتمادی کے ساتھ سُناتے ہیں۔ رئیسؔ اختر ایک باکمال شاعر ہیں، ان کی غزلیں اور نظمیں دلوں کو چھو لیتی ہیں۔ ان کے پڑھنے کا انداز منفرد ہے۔ ایک خاص ترنم سے بے خود و مست ہو کر شعروں کی کیفیت میں ڈوب کر کلام سناتے ہیں۔ دھیمے دھیمے لہجے میں ان کا ترنم سامع کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ رئیسؔ اختر نے تقریباً ہر صنفِ شاعری میں

شعر کہے ہیں۔ لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام "آئینۂ دل"
کو ہندوستان کی مختلف اُردو اکیڈیمیوں نے ایوارڈ دیا ہے۔ مختلف ادبی انجمنوں
نے انہیں اُن کی ادبی خدمات پر اعزازات عطا کئے ہیں۔
مشاعروں میں رئیس اختر ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے سامعین کے
دل میں اُتر جاتے ہیں۔ اِن میں انتظامی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔
مشاعرے ہوں کہ ادبی اجلاس و تہذیبی پروگرام نہایت عمدگی، شگفتگی
اور باوقار انداز میں اپنی ذمہ داری کو نبھاتے ہیں۔ رئیس بہترین مقرّر بھی ہیں۔
نپے تُلے جملوں سے سامعین کو متاثر کرتے ہیں۔
رئیس اختر کے خوشگوار روابط شہر کی تقریباً ہر اعلیٰ مرتبت شخصیت سے
ہیں۔ رئیس کی خوش کلامی کے ساتھ ساتھ خوش لباسی نے بھی ان کی شخصیت کو
پُراثر بنا دیا ہے۔ رئیس اختر میرے اُن خوش حال دوستوں میں سے ایک ہیں جن کا
ہاتھ ہمیشہ کشادہ رہا۔ شائد یہ ان کے نام کی تاثیر ہے۔ خدا نے رئیس کو ایک
اطمینان بخش زندگی عطا کی ہے۔ ماشاء اللہ شریکِ حیات اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔
جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے، بی ایڈ اور ایم فل کی ڈگری حاصل کر چکی ہیں۔ تدریس
کے مقدس پیشہ سے وابستہ ہیں۔ رئیس اختر کے لڑکے نہ صرف تربیت یافتہ ہیں
بلکہ زیورِ تعلیم سے بھی آراستہ ہیں۔ آج کل ان کے لڑکے ایکسپورٹ بزنس اور فائبر گلاس
انڈسٹری میں مصروف ہیں۔ اس طرح رئیس اختر منیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے اپنے
بچوں کے کاروبار کی نگرانی بھی کیا کرتے ہیں۔ مجھے رئیس اختر کی دوستی پر اس لئے
بھی فخر حاصل ہے کہ میں نے رئیس اختر کو اپنے خاص دوستوں کی فہرست میں

صحیح مقام پر پایا ہے۔

رئیس اختر کا تاحال صرف ایک مجموعۂ کلام (آئینۂ دل) شائع کرا چکا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس اس وقت ۳،۴ مجموعوں کا مواد موجود ہے۔ کلام کی اشاعت کے بارے میں بھی وہ تساہل سے کام لیتے ہیں حالانکہ میں انہیں اس جانب توجہ دلاتا رہتا ہوں۔ مجھے اُس دن بے حد خوشی ہوگی جب رئیس اختر کے کچھ اور مجموعے شائع ہوجائیں۔ ہاؤزنگ بورڈ میں انسپکٹر کے عہدہ پر فائز رہے۔ دوران ملازمت رئیس اختر نے بے شمار احباب کی مدد کی ہے۔ کئی شاعروں اور ادیبوں کے مسائل اپنی شخصی دلچسپی سے حل کرواتے ہیں، بعض شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ان کا بے لوث تعاون ناقابلِ فراموش ہے۔

رئیس اختر بھی حیدرآباد کے اُن مقبول شاعروں میں سے ایک ہیں جنہیں خدا نے اپنی خاص مہربانی سے ایک باوقار مقام عطا کیا ہے۔ رئیس اختر کئی کل ہند مشاعرے پڑھنے کے علاوہ جدہ (سعودی عرب) کے مشاعرے میں بھی شرکت کر چکے ہیں (جہاں ان کا کلام بے حد پسند کیا گیا)۔ حیدرآباد کی ایک جہاں سال ادب نواز شخصیت عارف قریشی نے ۳؍ڈسمبر ۱۹۹۲ء کو جدہ میں اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں حیدرآباد سے امیر احمد خسرو، رئیس اختر اور میں (صلاح الدین نیر) نے شرکت کی تھی۔ رئیس اختر کا ساتھ، دوران سفر اور دوران قیام جدہ نہایت خوشگوار رہا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی رہے۔ حسن اتفاق سے جاتے وقت اور آتے وقت یعنی حیدرآباد سے بمبئی، بمبئی سے جدہ اس طرح جدہ سے دوحہ قطر اور بمبئی اور بمبئی سے حیدرآباد ہم پلین میں ساتھ ساتھ بیٹھے

رہے جس کی وجہ سے ہزاروں میل کا سفر خوشگوار رہا۔ ہم نے طوافِ خانۂ کعبہ
اور تین مرتبہ عمرہ کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے کے بعد بارگاہِ سرورِ کائنات پر
حاضری دی۔ رئیس اختر بادیدۂ نم وارفتگی کے عالم میں خانۂ کعبہ کا طواف کرتے
رہے اور میری طرح اُنہوں نے بھی ہر طواف کے دوران حجرِ اسود کا بوسہ لیا۔
وقت مقررہ کے باوجود رئیس اختر کعبہ شریف کے احاطہ سے نکلنا نہیں چاہتے تھے
یہی حال میں نے مدینہ میں بارگاہِ رسالتِ مآب صلعم میں دیکھا کر رئیس اختر پر ایک
خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ اشکبار تھے۔

معاشرہ میں رہنے والے ہر شخص کے جہاں کئی دوست ہوتے ہیں وہیں
اس کے کئی بدخواہ بھی ہوتے ہیں۔ میں اپنی دوستی کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ
رئیس اختر کو چاہنے والے لوگ ہی مجھ سے ملتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک ایسا
وقت عنقریب آئے گا کہ رئیس اختر کی شاعرانہ فضیلت کا کھُل کر اعتراف کیا
جائے گا اور شعری ادب میں رئیس اختر کا نام بھی حیدرآباد کے شاعروں کی اولین
فہرست میں شامل رہے گا۔

رئیس اختر کے شاعر دوستوں کی طویل فہرست میں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ
یہ نام کچھ زیادہ ہی نمایاں ہیں۔ صلاح الدین نیّر، فیض الحسن خیالؔ، ناصر کرنولی،
راشد آذر، رحمٰن جامی، ڈاکٹر صادق نقوی، اکمل حیدرآبادی، منانؔ منظور، نیہال سنگھ
ورما، ریاست علی تاج، صادق نوید، عزیز بھارتی، مومن خاں شوقؔ، گیان سنگھ شاطر
قاضی انجم عارفی، جوہر ہاشمی اور قمر الدین صابری اور علی الدین نوید وغیرہ۔ رئیس اختر
سینئر شعرائے کرام میں سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، المیر احمد خسرو، خواجہ شوقؔ،

کنول پرشاد کنول، منوہر لال بہار، نواز عابدی اور دیگر بزرگ شاعروں کا احترام کرتے ہیں۔

رئیس اختر کو بھی کئی برسوں سے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ دور درشن کے "انجمن" پروگرام اور نٹ ورک کل ہند سطح کے مشاعروں میں اپنا کلام سناتے رہتے ہیں۔ مشہور گلوکار ان کی غزلیں ساز پر پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی مشہور میوزیکل کمپنی (ایچ ایم وی) نے جگجیت سنگھ کی میوزک اور چترا سنگھ کی آواز میں ان کی غزل کو ایل۔ پی ریکارڈ میں پیش کیا ہے۔ رئیس اختر آج بھی "دیارِ ادب" کے صدر ہیں۔ اس انجمن کے تحت حیدرآباد میں معیاری و ادبی پروگرام منعقد ہوا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ رئیس اختر حیدرآباد کی مختلف ادبی، تہذیبی اور مذہبی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ رئیس اختر کی وضعداری کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ایک مثال یہ بھی ہے کہ گذشتہ ۱۰، ۱۵ سال سے وہ عیدین (عید الفطر، عید الضحیٰ) کے موقع پر شام میں جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر سے عید ملنے "سیاست" آفس جایا کرتے ہیں۔ صلاح الدین نیر اور فیض الحسن خیال بھی ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ رشتوں کی پاسداری میں رئیس اختر بے حد وضعدار انسان ہیں۔ وضعداری کی انتہا یہ بھی ہے کہ بہت سے خوشگوار لمحے ان کی پلکوں پر نور سحر بن کر چمک رہے ہیں۔ یادیں رئیس اختر کی زندگی کا عظیم سرمایہ ہیں۔ شاعر کی سرشاری رقت آمیز جذبات میں ڈوبے ہوئے شعر یادگار ہیں، ان لمحوں کے جو سایہ کی طرح شاعر کے ساتھ ساتھ ہم سفر ہیں۔

--

دلنواز شاعر، باوقار شخصیت

ڈاکٹر صادق نقوی

ڈاکٹر صادق نقوی میرے اُن اولین شاعر دوستوں میں سے ایک ہیں جن کی دلنواز شخصیت کے گہرے نقوش آج بھی میرے دل پر اسی طرح مرتسم ہیں جس طرح پہلی ملاقات کے موقع پر تھے۔ شہر کے مختلف کالجوں اور جامعہ عثمانیہ کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا وہ پر اثر ماحول، کون ایسا ہے جو لوٹا سکے۔

صادق، نظام کالج کے اُن پرکشش، سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے والے ایک ایسے ہونہار طالب علم کی طرح مقبول ترین شخصیت بن گئے تھے جن سے دوستی کے لئے نظام کالج کا کیا ذکر، شہر کے دیگر کالجس کے طلباء بھی متمنی رہتے تھے میں نے اکثر دیکھا ہے کہ صادق کے اطراف ذہین و باشعور طلباء و طالبات کا ایک مخصوص حلقۂ علمی و ادبی سرگرمیوں، خوش گپیوں اور خاص طور پر علمی و ادبی مباحثوں میں سرگرم عمل رہنے کے لئے سرگرداں دکھائی دیتا تھا۔

جس وقت صادق سے میری پہلی ملاقات ہوئی اس وقت وہ نظام کالج سے گراجویشن کی تکمیل کر رہے تھے۔ صادق سے میری پہلی ملاقات نظام کالج کے سالانہ جلسے کے موقع پر ہوئی تھی۔ اُن دنوں میں اُردو کا لیچ میں پی۔ اے۔ یو۔ سی کا

طالب علم تھا۔ یہ بات ۱۹۶۹ء کی ہے۔ اُس زمانے میں شہر کے ہر کالج کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں طلباء کی علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں عروج پر رہتی تھیں اور ہر سال ہونے والے اُردو فسٹیول کی وجہ سے مختلف کالجس کے سرگرم عمل طلباء و طالبات آپس میں اپنی دوستی کے رشتہ کو استوار کرنے میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ صادق نقوی سے پہلی ملاقات کا اثر میرے دل پر ایک خوشگوار گہرے اثر کی طرح ہے۔ بزمِ اُردو ادب نظام کالج کی جانب سے بین الکلیاتی مقابلہ شعر و سخن تھا۔ وہ زمانہ میری ابتدائی شاعری کا زمانہ تھا۔ میں اُردو کالج سے مقابلۂ شعر و سخن میں حصہ لینے کے لئے آیا تھا۔ اُس مقابلہ میں میرے علاوہ ڈاکٹر اشرف رفیع، سیدہ مجیدہ، ڈاکٹر صادق نقوی، طالب خوندمیری، سید علی خیال اور دیگر طلباء نے حصہ لیا تھا۔ حسنِ اتفاق کہئے کہ اُس بشیر النساء بشیر بین الکلیاتی مقابلہ شعر و سخن میں میری غزل کو انعام اول قرار دیا گیا، اِس طرح رولنگ شیلڈ اُردو کالج کے حصہ میں آگئی۔

صادق نقوی اُن دنوں نہایت پُر کشش، جاذبِ نظر شخصیت کے حامل تھے (آج بھی [illegible] اس میں کوئی شک نہیں) اپنے کالج کے ایک ہونہار طالب علم ہونے کی وجہ سے اُن کے چاہنے والوں میں بعض ایسے طلباء و طالبات بھی تھے جن میں سے اکثر و بیشتر بیرونِ ملک (امریکہ، کینیڈا، لندن اور خلیجی ممالک) وغیرہ میں اعلیٰ خدمات پر فائز ہیں۔ اگرچہ کہ صادق نقوی سے میری دوستی کا آغاز نظام کالج کے سالانہ جلسہ سے ہوا لیکن اِس رشتۂ دوستی کو شہر کے مشاعروں نے اور مضبوط کر دیا۔ اُس زمانے میں شہر میں بے شمار انجمنیں قائم تھیں جن کے زیر اہتمام

ہر ماہ پابندی سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اساتذۂ سخن میں علامہ نجم آفندی، مولانا شیخ احمد شطاری کامل، حضرت قدر عریضی، علامہ ناصر زید پوری، حضرت تاج قریشی، حضرت سیف حمری کے علاوہ اوج یعقوبی، خواجہ شوق اور خاور نوری اور اِس مرتبے کے دیگر شاعروں کا بھی کافی شہرہ تھا۔ میں اور میری طرح کے مبتدی شعرار صادق نقوی، فیض الحسن خیال، ساجد رضوی وغیرہ مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اُن محفلوں میں شرکت کی بدولت آدابِ نشست و برخواست، آدابِ گفتگو اور خاص طور پر آدابِ محفل کی تربیت سے آشنا ہونے کا ایک اچھا موقع ملتا تھا۔ پرانے شہر کے مشاعروں نے ہمیں اُن رموز سے بھی روشناس کروایا جو ہمارے بزرگوں کا ورثہ ہے۔

اُردو کالج کی طالب علمی کے زمانے (۱۹۵۹ - ۶۰ء) میں اُردو کالج، اُردو شعر و ادب کی سرگرمیوں کے لئے ایک مرکزی حیثیت کا حامل بن گیا تھا۔ سال بھر کئی بین الکلیاتی تحریری، تقریری، بیت بازی کے مقابلوں کے علاوہ بین الکلیاتی مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے علاوہ شہر کے تقریباً تمام کالجس کے طلبا و طالبات مشاعرہ میں حصہ لیتے تھے۔ ہر کالج میں بزم اُردو کے افتتاحیہ و اختتامیہ تقاریب اہتمام سے منائی جاتی تھیں۔ ایسی تقاریب میں خاص طور پر ہر کالج کی انجمنوں کے عہدہ داروں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اُس وقت علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ میں اپنے کالج کے انتخابات میں صدر بزم اُردو ادب کی حیثیت سے بلامقابلہ منتخب ہوا تھا۔ ویسے شاعر کی حیثیت سے بھی تمام کالجس میں میری پہچان ہو چکی تھی۔ ہر کالج کے فنکشن میں میری شرکت ضروری سمجھی جاتی۔ تمام

کالجس میں ادبی ماحول کی وجہ سے نئے نئے ایسے طلباء و طالبات جو شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے آپس میں اپنے مراسم بڑھانے لگے۔ اُن میں مشرقی طرزِ حیات کی تربیت یافتہ کچھ ایسی طالبات بھی تھیں جن سے ملاقات تو دور کی بات تھی اُن کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے دوسرے کالجس کے طلباء مواقع تلاش کرتے تھے اُن میں سے کچھ لوگ اب بھی خلوت و جلوت کی بارگاہوں میں اپنے اپنے منصب پر فائز رہتے ہوئے اپنے حُسنِ سلوک اور بلند کردار کی پرچھائیاں فضاؤں میں بکھیر رہے ہیں۔ ایسے پاکیزہ، صاف و شفاف چہروں سے اچانک کہیں ملاقات ہو جاتی ہے تو کئی برس پہلے کی خوشگوار محفلیں یاد آتی ہیں جن کا کچھ حصہ اب بھی یہ احساس دلاتا ہے کہ اب بھی رشتوں کی مہک خوشبو کا سفر طے کر رہی ہے۔

صادق نقوی ایک ذہین طالبِ علم کی حیثیت سے بھی ہمیشہ اساتذہ کی نظر میں رہے۔ کالج کے بعد کی زندگی، صادق کے لئے ایک جہدِ مسلسل کی زندگی رہی ہے لیکن الحمد للہ ہر مرحلہ پر اُنہیں کامیابی و کامرانی نصیب ہوتی رہی ہے۔ آج وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے ایک قابل ترین استاد کی حیثیت سے کارگذار ہیں۔ توقع ہے کہ بہت جلد وہ ریڈر سے پروفیسر اور صدر شعبہ بن جائیں گے۔

صادق نقوی شعبۂ تاریخ میں اکسپرٹ کی حیثیت سے تمام تعلیمی اداروں میں توقیر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ملک بھر کی یونیورسٹیوں کے علاوہ بیرونِ ملک کی یونیورسٹیوں میں بھی مدعو کئے جاتے ہیں۔ ملک کے مختلف سرکاری/نیم سرکاری انسٹی ٹیوٹ، علمی و ادبی اداروں اور مجالس میں اُن کی اعلیٰ

صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ لندن، پاکستان اور راس الخیمہ سے انٹرنیشنل سمیناروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ تاریخ میں ۴۸ تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں اور تقریباً ۵۴ نیشنل سیمنارس میں شرکت کی ہے۔

صادق نقوی ذاکرِ اہلِ بیت کی حیثیت سے بھی کافی شہرت رکھتے ہیں۔ اہلِ بیت سے دیوانہ وارنسبت وعقیدت، عزت و احترام نے اُن کے لب و لہجہ اور طرزِ تخاطب کو پُراثر بنادیا ہے۔ گھنٹوں واقعاتِ کربلا، شہادتِ حضرت امام حسینؑ اور اہلِ بیت کے موضوع پر گفتگو کرنے کی خدا نے انہیں صلاحیت بخشی ہے۔

ڈاکٹر صادق نقوی "نور" کے نام سے انگریزی زبان میں ایک رسالہ نکالتے ہیں، جس کا ملک اور بیرونِ ملک میں پُرتپاک خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ صادق نقوی ابتدا ہی سے یاربائش آدمی رہے ہیں۔ صادق کے طرزِ تکلم میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ سامعین پوری توجہ کے ساتھ اُن کے ہمسفر بن جاتے ہیں۔ کثرتِ مطالعہ اور علمی و ادبی مصروفیات نے صادق کو ایک ایسا جوہر عطا کیا ہے جس کا فیضان جاری و ساری ہے۔ تا حال صادق کی حسبِ ذیل ۵ کتابیں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ حیدرآباد کے قطب شاہی عاشور خانے (انگریزی)، مسلم مذہبی ادارے اور قطب شاہی میں (انگریزی)، روشن لکیریں (شعری مجموعہ)، ہدیۂ صادق (شعری مجموعہ)، روشن زاویے (شعری مجموعہ)۔ اخبارات، ادبی رسالوں کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے ذریعہ ان کا کلام اہلِ ذوق تک پہونچ جاتا ہے۔

صادق ایک باصلاحیت شاعر ہی نہیں، ایک معتبر ادیب و نقاد بھی ہیں
بہترین مقرر تو ہیں ہی، لیکن پُروقار دانشور بھی ہیں جو ادب و تاریخ کے موضوع پر
کھل کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ اساتذۂ سخن کا احترام، اپنے ساتھی شاعروں سے بلاتحفظ
ذہنی ملتے رہنا ان کا مزاج بن چکا ہے۔

صادق نقوی بھی میرے اُن بہترین دوستوں میں ایک اعلیٰ مرتبت دوست
ہیں، جن کی دوستی پر میں فخر کرتا رہوں گا۔

——

کھرا انسان - سچا دوست - بہترین شاعر

رحمٰن جامی

ہر انسان کی زندگی میں کچھ ایسے بھی لمحے آتے ہیں جو خوشگوار روابط و تعلقات کے باوجود بھی موقتی فاصلوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یوں بھی تو ہوتا ہے کہ زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ سارے فاصلے سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ یہی بات میرے اور رحمٰن جامی کے درمیان ہوئی۔

جب کسی انسان سے نئی نئی ملاقات ہوتی ہے تو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا، لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ برسوں ساتھ رہنے کے باوجود بھی ایک دوسرے کو سمجھنے کا عرفان حاصل نہیں ہوتا۔ بعض لوگ پہلی ہی ملاقات میں سمجھ میں آجاتے ہیں اور بعض لوگوں کو سمجھنے کے لئے ایک عمر گذارنی پڑتی ہے۔ اگر انسان کو اپنی زندگی کے اولین سفر کے دوران اس بات کا احساس ہو کہ اپنے مدمقابل اپنے ہی قبیلہ کا آدمی ہے تو ایک پُرسکون اطمینان حاصل ہو جاتا ہے رحمٰن جامی کا تعلق بھی ایسے ہی ایک قبیلہ سے ہے جس کے تیور، تلوار کی تیز دھار اور جس کی گفتگو پُرخلوص لب و لہجہ کی بے ساختگی اور والہانہ پن کی ضمانت دیتے ہیں اور جن لوگوں کی زندگی آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہوتی ہے۔ اُن کی

زندگی کسی غیر مرئی مرحلہ پر، ممکن ہے کہ دھوکہ کھا جائے لیکن دھوکہ دے نہیں سکتی۔ اِس قبیل کے سچے دوست اور سچے آدمی کم یاب ہوتے جا رہے ہیں لیکن رحمٰن جامی کا وجود طمانیت کا باعث ہے۔

رحمٰن جامی سے میری دوستی کی اساس شعر وادب کے اُن روز و شب سے تعلق رکھتی ہے جس میں تخلیق کار اپنی معنوی اولاد کو بہتر سے بہتر سے بہترین تشکل و صورت میں دیکھنے کا متمنی رہتا ہے۔

اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ہر نیا شاعر اپنی شخصیت کے خد و خال میں رنگ بھرنے، سنوارنے، بنانے اور نکھارنے میں مصروف رہتا ہے۔ اُس کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیت سے اپنے فن کا پُر اثر انداز میں مظاہرہ کرے (جبکہ ہم دونوں کی شاعری کا عنفوانِ شباب تھا)۔

کچھ شاعر دوست جہاں رحمٰن جامی کو ایک کہنہ مشق شاعر، ماہرِ علم عروض صاحبِ اُسلوب ادیب، بالغ نظر نقاد اور بے باک مقرر سمجھتے ہیں وہیں کچھ شاعر دوست ایسے بھی ملیں گے جو رحمٰن جامی کی انسان دوستی، اُصول پسندی اور ادب نوازی کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ ہر انسان میں جہاں مختلف قسم کی خوبیاں ہوتی ہیں وہیں اس میں کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں لیکن مجھے روابط کے اِس طویل سفر میں رحمٰن جامی کی صرف خوبیوں سے ہی واسطہ رہا۔ رحمٰن جامی کی بلانوشی ایک طویل عرصہ تک اُن کی خامیوں کا لبادہ اوڑھے اُن کی شخصیت کو مسموم کرتی رہی۔

شراب نوشی نے محفلِ شعر و ادب اور معاشرہ کے کچھ قابلِ احترام حصوں کو بھی متاثر کیا تھا لیکن آخر کب تک ہ؟ ہر چیز بالآخر اپنی اصلیت کی طرف لوٹتی ہے چنانچہ

اللہ کا ایسا کرم ہوا کہ رحمٰن جامی کی دنیا ہی بدل گئی ۔ پھر وہ دین و دنیا کی تمام راحتوں اور لذتوں سے بہرہ ور ہوتے رہے ۔ ترک مے نوشی نے جامی کے طرزِ حیات کو قابلِ احترام بنا دیا ہے ۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں نے جامی کو اُن کے ہر روپ میں پسند کیا ہے ہر وہ انسان جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو مجھے اچھا لگتا ہے اور جب کوئی ساتھی میرے اُصول کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے تو میں دوستی کے ہر مرحلہ پر اُس کا استقبال کرتا ہوں ۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ جامی سے میری ملاقات کی بنیاد مشاعروں کی معرفت سے ہوئی ۔ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی کہ اپنے ہی قبیلہ کا ایک اچھا آدمی جام و مینا سے اِس حد تک دوستی کرے کہ آگہی اور بے خودی کا فرق ہی مٹ جائے ۔ اُن دنوں جامی کے دوست و احباب اُن سے گفتگو کرتے ہوئے کتراتے تھے ۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ میرے شہر کا ایک بہترین شاعر اپنی مقبولیت کھوتا جا رہا ہے ۔ وہ رحمٰن جامی جس کی رومانی نظمیں ہر سطح کے صاحبِ ذوق خواتین و حضرات کو متاثر کرتی رہی ہوں ، وہ رحمٰن جامی جس کا کلام ہند و پاک کے ہر معیاری رسالے میں چھپتا ہو ، وہ رحمٰن جامی جس کو اپنی ابتدائی شاعری کے اولین مراحل پر ہی مقبولیت کا اعزاز حاصل ہوا ہو ، جب معاشرے سے کٹتا جا رہا تھا تو مجھے بے حد دُکھ ہوتا تھا ۔ جامی کا جام و مینا سے رشتہ ٹوٹتے ہی گویا ان کی حیات طویل ہو گئی ۔ میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ جامی حیدرآباد کے کُل ہند مشاعروں میں کلام سُناتے رہیں ۔ جامی ادبی ٹرسٹ اور سنسکرتی مشاعروں میں کلام سناتے ہوئے اپنی ذی وقار شاعرانہ حیثیت کے ساتھ اپنے منصب پر فائز ہیں ۔

دورِ حاضر کے ممتاز اساتذہ سخن میں رحمٰن جامی کا بھی ایک منفرد مقام ہے ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن اُن میں "قدیر انصاری" "آتش پڑھ بھونگیری" اور "نسیم اعجاز نسیم" زیادہ نمایاں ہیں۔ رحمٰن جامی کو ہر صنفِ سخن میں شعر کہنے کا ملکہ حاصل ہے۔ شعری ادب میں جدت طرازی کے ساتھ نئے نئے تجربات کرتے رہنے کے عادی ہیں لیکن وہ اپنی بنیادی شاعرانہ روش سے انحراف نہیں کرتے، یعنی غزل کے علاوہ پابند نظم کو دلی کیفیات، تجربات، مشاہدات اور تخیلات کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ جامی بنیادی طور پر ایک ایسے شاعر ہیں جو کلاسیکی اقدار کا احترام کرتے ہیں۔ ترقی پسندانہ خیالات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے عصری آگہی کے ترجمان بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں جیتی جاگتی، چلتی پھرتی زندگی کی وہ تمام دھڑکنیں ملتی ہیں جو حیاتِ جاوداں کی طرح فرحت افزا ہے۔ موضوعاتی شاعری میں جامی اپنی آپ مثال ہیں۔ مختلف موضوعات پر انہوں نے بے شمار نظمیں کہی ہیں۔ ہر موضوع پر اولین تاثر قبول کرنے والے شاعروں میں جامی کچھ زیادہ ہی رواں دواں ہیں۔

رحمٰن جامی کی مشاعروں میں آمد یہ احساس دلاتی ہے کہ ایک قدآور شاعر موجود ہے۔ شعر سنانے کا انداز فاتحانہ رہتا ہے۔ طرزِ تخاطب پُراثر ہونے کے علاوہ مخاطب کو مزید گفتگو جاری رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جامی ایک کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں، جو بھی اُن سے ملتا ہے وہ اُن کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ جامی جس محفل میں بھی رہتے ہیں، شعراء کے علاوہ شرکائے محفل بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ جامی محفل میں موجود ہیں۔ ان کی نشست و برخواست، اندازِ گفتگو، بار بار مسکرادینا

کبھی دھیمے لہجے میں اور کبھی اونچی آواز میں مصروفِ تکلم رہنا اور کوئی غیر معمولی بات دورانِ گفتگو وقوع پذیر ہو تو بڑھ کر مصافحہ کرنا، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جامی کی شخصیت کے پہلو ہیں جن کا بے ساختہ اظہار ہوتا رہتا ہے۔ جامی کی زندگی میں وہ غیر مرئی ساعتیں جو ان کی زندگی کا حاصل ہیں، اپنی تنہائی میں صبح کی پہلی کرنوں کی طرح ان کی شخصیت کو سنوارنے میں مصروف ہیں۔

دو سال قبل جامی کا پہلا مجموعۂ کلام "جام انا" شائع ہوا ہے، جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ جامی کے غیر مطبوعہ سرمایۂ سخن کو اگر کتابی شکل دی جائے تو بہ آسانی بہ یک وقت ۱۷، ۱۸ مجموعے شائع ہو سکتے ہیں۔

جامی وعدہ کے پابند، اصول کے پاسدار، روابط کے استحکام اور مراسم کے رمز شناس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جذباتی انسان بھی ہیں۔ کوئی بات اگر مرضی کے خلاف ہو تو وہ آگ ہو جاتے ہیں جب سنجیدہ ہو جاتے ہیں تو ان کی طبیعت موم بن جاتی ہے، پھر ان کی نرم گفتاری فاصلوں کو گھٹانے کی ترغیب دیتی ہے۔

رحمٰن جامی ہمارے شہر کے ان اہم شاعروں میں سے ایک ہیں جن کا نام شعر و ادب کے حلقوں میں ہر دور میں توقیر کی نگاہوں سے پڑھا جائے گا۔

خوش نظر، خوش گفتار اور بے نیاز شاعر

ناصرؔ کرنولی

یوں تو ہر انسان کو اپنی زندگی میں بے شمار لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان گنت لوگوں سے جان پہچان ہو جاتی ہے۔ معاشرے میں پھیلے ہوئے انسان زندگی کے مختلف تقاضوں سے رشتوں میں بندھے ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے خود بہ خود رسم و راہ بڑھانے کو جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایسے کچھ لوگوں سے جو پہلی نظر ہی میں اچھے لگتے ہوں ان سے دوستی کی جائے۔ ناصرؔ کرنولی میرے ایسے ہی دوستوں میں سے ایک ہیں انھیں پہلی بار دیکھنے کے بعد دوستی کے لئے راہ ہموار ہوتی چلی گئی۔

ناصرؔ کرنولی سے میری پہلی ملاقات زائد از ۲۵ برس پہلے کرنول میں منعقدہ ایک کل ہند مشاعرہ میں ہوئی تھی۔ اس مشاعرہ کا اہتمام کرنول کی ایک ذی اثر مشہور شخصیت نواب طلعت اللہ خاں نے کیا تھا۔ نواب صاحب خود شاعر تھے، انتہائی نیچ دار اور شائستہ طبیعت کے مالک تھے۔ اس مشاعرہ میں شکیلؔ بدایونی، صباؔ افغانی نسرتؔ بیتے پوری کے علاوہ حیدرآباد سے محترمہ عظمت عبدالقیوم، بانو طاہرہ سعید، مغیرات ندیم، صلاح الدین نیرؔ نے بھی شرکت کی تھی۔ اس زمانے میں کرنول میں عظیم الشان

پیمانے پر کُل ہند مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

ناصر کرنولی سے میری دوسری ملاقات حیدر آباد کے ایک قدیم محلے ملک پیٹ میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں ہوئی۔ اس مشاعرہ میں اُس دور کے اہم شاعروں کے ساتھ ساتھ ناصر کرنولی اور میں نے بھی کلام سُنایا تھا۔ ناصر کرنولی اُن دنوں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کررہے تھے۔ اُس زمانے میں صالحہ الطاف کی ادارت میں شائع ہونے والے ایک ادبی رسالہ "خاتونِ دکن" کا میں مدیر اعزازی تھا۔ اُسی زمانے میں ناصر کرنولی نے بھی "پونم" کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا تھا۔ انہوں نے "پونم" کو معیاری بنانے میں بے حد محنت کی تھی۔ تقریباً ۲۰، ۲۲ برسوں تک پرچہ شائع ہوتا رہا۔ اُن دنوں ناصر حیدر آباد کے ادبی حلقوں سے کچھ زیادہ واقف نہیں تھے۔ شہر کے شاعروں اور ادیبوں سے تعارف کے سلسلے میں، میں نے ناصر کرنولی کا ساتھ دیا۔ اس طرح ناصر کے حلقۂ احباب میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حیدر آباد کا غالباً میں پہلا شاعر ہوں جو ناصر کرنولی سے زیادہ قریب رہا۔ پھر ہم نے بہت سے مشاعرے ایک ساتھ پڑھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات پُرخلوص دوستی میں بدلتے گئے اور ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست بن گئے۔ جس خلوص کی بنیاد پر ہم نے دوستی کا آغاز کیا تھا آج تک اُس میں تازگی باقی ہے۔

جب ہم نئے نئے شاعر تھے تو اُس زمانے میں مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ شہر کے علاوہ مختلف اضلاع میں بھی بڑے ہی اہتمام کے ساتھ مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے علاوہ کالجس میں بھی مشاعرے ہوتے تھے۔ کالجوں کے مشاعروں میں بھی ناصر کرنولی بے حد پسند کئے جاتے تھے۔ بعض شاعروں

کو آٹوگراف دینے کے سلسلے میں کچھ خوشگوار واقعات سے بھی گذرنا پڑتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ حیدرآباد کے ایک گرلس کالج کے مشاعرہ میں شریک ایک خوبصورت شخصیت کی نگاہیں ناصر کی نظروں سے اُلجھتی رہیں۔ برسوں اُس "حاصل مشاعرہ" شخصیت سے ان کے والہانہ روابط رہے۔ سلسلۂ روابط طویل ہوتا گیا لیکن دورانِ سفر ایک موڑ ایسا بھی آیا کہ دو مسافر عین منزل کے قریب بچھڑ گئے۔ جو کہانی شروع ہوگئی تھی ختم تو نہیں ہوئی لیکن ادھوری رہ گئی۔ ناصر کرنولی کی شخصیت ہی ایسی پرکشش تھی کہ لوگ اُن سے دوستی کے خواہاں رہتے تھے۔

ناصر ایک بہترین دوست، بہترین شاعر و نقاد کی حیثیت سے بھی ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے احباب کی فہرست بھی طویل ہے لیکن اس فہرست میں کچھ ہی احباب ایسے ہیں جن سے ان کے بے تکلفانہ روابط ہیں۔ ایک سنجیدہ مزاج، شگفتہ طبیعت اور پُر خلوص انسان ہیں۔ احساسِ ذمہ داری وابستگی و وارفتگی اُن کی عمدہ خصوصیات میں شمار کی جاتی ہیں۔

ناصر کرنولی ویوک وردھنی کالج میں صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ابتدائی ملازمت کے زمانے سے آج بھی ناصر کرنولی ایک قابل استاد، اسٹاف کے حق میں بہترین ساتھی، انتظامیہ کے لئے ایک اہم مشیر کی طرح شہرت رکھتے ہیں۔

"نفس نفس" کے نام سے ان کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ اُردو اکیڈیمیوں نے ایوارڈ سے نوازا۔ اس وقت اُن کے ہاں کچھ اور مجموعوں کی اشاعت کے لئے تخلیقات موجود ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کب اپنے اور

مجموعوں کی اشاعت میں دلچسپی لیں گے۔ ناصر کرنولی کا کلام روز نامہ سیاست میں شائع ہونے کے علاوہ ملک کے اہم ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ گزشتہ تین دہوں سے آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے کلام نشر ہو رہا ہے۔ تحت اللفظ میں بھی اور ترنم میں بھی شعر سناتے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے ادبی رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔

ناصر اپنے کالج میں کئی یادگار مشاعرے منعقد کئے۔ خاص طور پر وہ مشاعرہ جس میں فراق گورکھپوری نے شرکت کی تھی، ناقابل فراموش ہے۔ ناصر اپنی نجی مصروفیات کی وجہ سے شہر کی شعری و ادبی سرگرمیوں میں بہت کم حصہ لے رہے ہیں۔ وہ حیدر آباد کے اُن پسندیدہ شاعروں میں سے ایک ہیں جن کا کلام دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے

ناصر کرنولی بھی میرے اُن ہم خیال بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں جن سے گفتگو کرتے ہوئے میں تازگی محسوس کرتا ہوں اور جن کی دوستی میرے احساسات مہکاتی رہتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ناصر سے تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ خاص طور پر مدینہ ہوٹل کی ملاقاتیں جہاں ہم (رئیس اختر، فیض الحسن خیال، صلاح الدین نیر) رات کے ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک پابندی سے بیٹھا کرتے تھے۔ ناصر کرنولی کے علاوہ کچھ اور شاعر و ادیب بھی ملنے کے لئے مدینہ ہوٹل آجاتے تھے۔ مدینہ ہوٹل میں ہماری بیٹھک تقریباً دس سال رہی۔ بڑے خوشگوار دن تھے وہ! اب نہ وہ نشستیں رہیں اور نہ وہ ماحول اور نہ وہ دن رات، زندگی ہے کہ مشین بنی ہوئی ہے۔ چاہے وہ موسم خزاں ہو کہ موسم بہار اچھے دوست ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ناصر کرنولی بھی میرے اُن اولین شاعر دوستوں میں سے ایک ہیں جن کی دوستی کی پہلی خوشبو آج بھی میرے جسم و جاں کو مہکا رہی ہے

-٥- -٥- -٥-

معاشرہ کا تیز رو مسافر

ڈاکٹر مصطفےٰ کمال

بعض شخصیتوں میں وضع داری اِس حد تک جذب ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے قریب ترین دوستوں کو بھی پوری طرح بے تکلف ہونے نہیں دیتی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ بات ڈاکٹر مصطفےٰ کمال پر صادق آتی ہے۔ ایسی پُر وقار شخصیتیں دوستی کے کسی مرحلے پر بھی قربت و فاصلہ کے امتیاز سے بے نیاز رہنے بھی تو نہیں دیتیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ دوست وضع داری کے مفہوم کو تسکینِ ذات کی حد تک محدود رکھتے ہوں لیکن یہ بات واضح ہے کہ طرزِ حیات میں رکھ رکھاؤ، رواداری اور سنجیدگی میں ٹھہراؤ، تعلقات کی بہتری و استواری میں نمایاں حصہ ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کے معاملہ میں ہر وہ شخص جو بہترین دوست ہونے کا دعویدار ہو شائد ہی اِس خطِ فاصل کو عبور کر گیا ہو۔ میں ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کو اپنا بہترین قریبی دوست سمجھتا ہوں لیکن ان کی وضع داری نے مجھے بھی آج تک پوری طرح بے تکلف ہونے نہیں دیا۔ یہ بات الگ ہے کہ جب کبھی ہم کچھ دوستوں کی کم سِن نوازیوں سے آنکھیں پھیر کر حیاتِ گذشتہ کے کچھ اوراق اُلٹتے ہیں تو ان اوراق پر ہمیں کچھ ایسے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں جو دھندلے ہوتے ہوئے بھی اپنی چمک برقرار رکھے

ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ حالات کی گرم ہواؤں نے ہمیں جھلسانے کی سازش کی ہو لیکن ہمارے تعلقات کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ ہو سکی۔ چونکہ ہم نے ٹھنڈی چھاؤں، ہلکی ہلکی روشنی اور تازہ تازہ خوشبوؤں کے درمیان اپنی دوستی کی بنیاد رکھی تھی۔

ڈاکٹر مصطفےٰ کمال سے کب، کس وقت اور کن حالات میں دوستی ہوئی، کچھ اچھی طرح یاد نہیں ہے لیکن مصطفےٰ کمال کو یاد ہے کہ پروفیسر عبدالقادر سروری کے دولت کدہ (حمایت نگر) پر ۳۰ سال قبل جو ادبی و شعری محفلیں ہوتی تھیں، میں بھی اُن میں شریک ہوا کرتا تھا۔ پروفیسر سروری کی قیام گاہ پر تقریباً ہر ماہ پابندی سے ادبی نشستیں ہوتی تھیں، اُن میں شریک رہتا اور یوں بھی ہوا کہ میں نے بعض مشاعروں کی معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔ اُن محفلوں میں جہاں شہر کے منتخب شاعر و ادیب شریک رہا کرتے وہیں کالجس اور جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور باذوق طلباء بھی موجود رہتے تھے۔ سروری صاحب کے مکان میں آل انڈیا اردو فیسٹول (۶۰ - ۱۹۵۹ء) کی کئی کمیٹیاں تشکیل پائیں۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کمال صاحب کا کونسی کمیٹی سے تعلق تھا، البتہ میں مشاعرہ کا کنوینر منتخب ہوا تھا۔ کمال صاحب کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ وہ یونیورسٹی سائنس کے طالب علم ہیں۔

اُردو فیسٹول کے بعد شہر کی مختلف ادبی و تہذیبی محفلوں میں کمال صاحب یقیناً شریک رہے ہوں گے، لیکن اُن سے میری ملاقات ہوتی تھی یا نہیں کچھ یاد نہیں ہے۔

۱۹۶۵ء میں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد میں اُردو سکشن کے پروگرام ایکزیکیٹیو مسٹر اے جی قاروقی تھے۔ مجھے اُن کے دور میں پروگرامس پابندی سے ملتے تھے۔

فاروقی صاحب نوجوانوں کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتے تھے۔ اُس زمانے میں ہم جیسے نوجوانوں کی خاطر خواہ پذیرائی ہوتی تھی۔ اُن دنوں میرا پہلا مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" شائع ہوچکا تھا۔ میں نے تبصرہ کے لئے اپنا مجموعہ فاروقی صاحب کے حوالہ کیا۔ میری خواہش تھی کہ وہ کسی سینئر ممتاز دانشور سے تبصرہ کروائیں۔ لیکن فاروقی صاحب نے کہا کہ "مصطفےٰ کمال ایک ذہین و باشعور نوجوان ہیں" میں نے ان کو عمداً آپ کی کتاب تبصرہ کے لئے دی ہے' یقین ہے تبصرہ آپ کو پسند آئے گا مصطفےٰ کمال اُن دنوں رہنمائے دکن کا ادبی صفحہ دیکھتے تھے۔ غالباً اُسی زمانے میں وہ بھارت سیوک سے بھی وابستہ تھے۔ جب کمال صاحب کا تبصرہ نشر ہوا تو مجھے اُن کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اُس زمانے میں بہت سے نوجوان منظرِ عام پر آئے۔ مصطفےٰ کمال بھی ایک فرض شناس' دیانت دار شخصیت کی طرح نہ صرف اُردو زبان و ادب کی سرگرمیوں سے عملاً وابستہ ہوگئے بلکہ وہ اُردو تحریک کے مختلف مسائل سے دلچسپی لینے لگے۔ انجمنِ تحفظ اُردو آندھرا پردیش کے معتمد کی حیثیت سے اُنہیں حکومت کے سربراہوں سے اُردو کے مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع ملتا رہا۔ مصطفےٰ کمال کی شخصیت کا دائرہ بتدریج وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور وہ رفتہ رفتہ اپنی عمدہ صلاحیتوں کا اظہار کرنے لگے۔ جب شہر کی کچھ اہم شخصیتوں اور بعض اہم اداروں کے سربراہوں نے اُس وقت یہ محسوس کیا کہ نوجوانوں کی ایک لمبی قطار میں ایک ایسا نوجوان بھی ہے جس کی اعلیٰ صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے تو اُنہوں نے مصطفےٰ کمال کو اپنی سرگرمیوں میں شامل کرلیا۔ مصطفےٰ کمال نے اُن علمی و ادبی' فلاحی و تہذیبی انجمنوں سے وابستہ رہ کر نہ صرف اپنی شخصیت کو

منوایا، بلکہ بعض ایسے ادارے جو سست روی کا شکار ہوتے جا رہے تھے انہیں تیز قدمی کا احساس دلایا اور انہیں اس قابل بنانے میں تعاون کیا۔ آج یہ ادارے بڑے بڑے مستند اداروں سے آنکھ ملا کر گفتگو کرنے کے موقف میں ہیں۔

مصطفےٰ کمال شروع ہی سے صرف کام کرنا جانتے ہیں، شخصیت کی تشہیر ان کے مزاج کو نہیں بھاتی۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال نے اپنی عملی زندگی میں آہستہ آہستہ اتنے طویل اور کامیاب فاصلے طے کئے ہیں کہ ان کے نقشِ قدم مشعلِ راہ بن گئے ہیں۔

مصطفےٰ کمال سے میری سرسری ملاقات دوستی کے دائرہ میں اس وقت داخل ہوئی جب زندہ دلانِ حیدرآباد کی سرگرمیاں پروان چڑھ رہی تھیں۔ مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ زندہ دلانِ حیدرآباد سے مزاح نگاروں کی پہلی کانفرنس (١٩٦٦ء) سے آج تک وابستہ ہوں۔ زندہ دلان کے مختلف اجلاس اور مختلف پروگراموں کے سلسلے میں ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ہر ایسے موقع پر یہ محسوس کیا کہ سارے اراکین میں ایک صائب الرائے ایسا بھی شخص ہے جس کی بات شاذ ہی رد ہوتی ہو اور وہ شخص اپنی بات دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے تمام اراکین کو کنوینس کر سکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ کمال زبان و ادب کے مسائل اور تنظیمی معاملات میں کبھی جذباتی نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں تنظیموں کے معاملات میں جذباتی ہوتے دیکھا۔ ان کی طبیعت کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ وہ کسی موضوع پر سرسری یا تفریحاً گفتگو نہیں کرتے۔ موضوع کی ہیئت ترکیبی

اور اس کی ماہیئت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد ہی۔ حصّہ میں حصہ لیتے ہیں (اور الحمد اللہ کامیاب رہتے ہیں)۔ زندہ دلان سے وابستہ ہر رکن اپنی جگہ ایک مقام رکھتا ہے۔ اندازِ گفتگو، طرزِ تخاطب، معاملہ فہمی بھی ایک آرٹ ہی تو ہے اور اس خداداد صلاحیت و ہنر سے ہر رکنِ انجمن کو فیض پہونچ رہا ہے۔ انتخاب اور ذاتی پسند کی جہاں بات آتی ہے تو میں نے ہر رکن کے لئے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے۔ ویسے بھی ہر رکن اپنی اپنی صلاحیتوں سے زندہ دلانِ حیدرآباد کی داغ بیل سے لے کر آج تک اپنی وابستگی کا حق ادا کر رہا ہے۔

مصطفےٰ کمال کلاسیکی اقدار کے ترجمان ہیں اور ترقی پسند، روشن خیال، اور عصری آگہی سے باتجربہ باتیں انسان بھی ہیں۔ شگوفہ کے دفتر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی شاعر و ادیب دکھائی دیتا ہے۔ میں نے مصطفےٰ کمال کو کبھی تنہا نہیں دیکھا۔ انہیں خدا نے یہ صلاحیت بھی دی ہے کہ دوستوں کے ہجوم میں بھی شگوفہ کا کام کر لیتے ہیں۔ اُن کے ذہن و شعور کے گوشوں میں اتنی وسعت ہے کہ خارجی ماحول اُن کے کام میں حارج نہیں ہوتا۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کاتبینِ شگوفہ بھی اُن سے بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خوش اخلاقی، حساب فہمی اور معاملات میں پاک و صاف رہنے کی بہرحال اہمیت ہے۔ شگوفہ کے کاتبین کم از کم گریجویٹ ہیں۔ کاتبین کا انتخاب مصطفےٰ کمال کا ایک خاص وصف ہے۔ شگوفہ سے وابستہ کاتبین میں محمد غالب، محمود سلیم اور مسعود انور کے نام نمایاں ہیں۔ کمال صاحب کے بارے میں یہ شہرت ہے کہ وہ کاتبین کو کام سے زیادہ اُجرت دیتے ہیں اور حساب کتاب کے معاملے میں بے حد کھرے انسان ہیں۔ یہ بات مسعود انور نے بتائی۔ میں

نے مسعود انور کو جب پہلی دفعہ شگوفہ کی کتابت کرتے ہوئے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں نہ صرف اُن کی کتابت پسند آئی بلکہ مسعود انور کی خوش اخلاقی اور کم گوئی نے بھی متاثر کیا۔ میں نے مصطفےٰ کمال کی معرفت مسعود انور سے اپنے روابط بڑھائے۔ چنانچہ آج بھی خالص دوستانہ فضاء میں مناسب اُجرت کے ساتھ کتابیں لکھوا رہا ہوں۔

کمال صاحب کے دوستوں کی طویل فہرست میں ہر مکتبِ خیال کا شاعر اور ادیب دکھائی دے گا۔ کمال صاحب کی مقبولیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ انہوں نے زبان و ادب کے اس تیز رفتار سفر میں کسی وقت بھی کسی محدود حلقے میں اپنے آپ کو محصور نہیں کر لیا' بلکہ کھلی فضاؤں میں اُڑنے والے طائرِ خوش نوا کی طرح سانس لیتے ہوئے ہر ساتھی کو یہ بھی مشورہ دیتے رہے کہ معاشرہ میں اگر کامیاب زندگی گذارنی ہو تو کھُل کر سانس لیا کرو، بند کمروں کی گھُٹی گھُٹی فضاء صحت کے لئے مضر ہے۔ کھُلی فضاء میں تازہ ہوا ملتی ہے جو دماغ کو تازگی اور دل کو ٹھنڈک بخشتی ہے۔ جس کسی کو بھی مصطفےٰ کمال کے کردار کی بلندی کا جائزہ لینا مقصود ہو تو اُس کے لئے ضروری ہو گا کہ پہلے وہ اُن کی اصول پسندی، شرافت، دیانت داری، بے لوث اور بے غرض روابط کا جائزہ لے۔ مصطفےٰ کمال بنیادی طور پر نیک نفس اور شریف انسان ہیں۔ اُن سے مراسم و دوستی کے نازک فرق سے گذرتے ہوئے بھی قریبی احباب یہ چاہیں گے کہ مصطفےٰ کمال ہر نفس ایک کامیاب انسان کی طرح زندگی کے ہر مرحلہ کو خوش خرامی کے ساتھ طے کرتے رہیں۔

ڈاکٹر مصطفےٰ کمال صدر شعبۂ اُردو انوار العلوم کالج کی حیثیت سے

پُروقار اور با اعتماد فضا میں اپنا فرض منصبی انجام دے رہے ہیں۔ اُن کی پُرکشش شخصیت کی ایک خوبی یہ [illegible] بھی ہے کہ کالج کے ہر دور میں قابلِ قدر و قابلِ عزت و احترام اُستاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ خلیل اللہ حسینی صاحب سے لے کر نواب شاہ عالم خاں صاحب تک کالج کا ایک طویل سفر ہے۔ اس سفر میں شرکت نے مصطفےٰ کمال کو ایک تراشیدہ ہیرا بنادیا ہے۔ کالج کی بہتری کے لئے انہوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ وہ ہر دور میں ایک مخلص کارکن کی حیثیت سے بھی کالج کی بہترین اور ترقی پذیر اسکیمات میں بھرپور تعاون کرتے رہے ہیں۔ آج کے انتظامیہ کی نظر میں مصطفےٰ کمال ایک ذمہ دار استاد کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک ممتاز ادیب و نقاد کی حیثیت سے قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ کالج کے معاملات میں مصطفےٰ کمال کی مشاورت کو بھی یقیناً اہمیت دی جاتی ہوگی کیونکہ وہ پوری توانائی و احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ مصطفےٰ کمال کی بھرپور شخصیت نے قابلِ رشک حد تک انتظامیہ، اساتذہ اور طلباء و طالبات میں مقبولیت حاصل کی ہے۔

گذشتہ ۴۲ برس سے شگوفہ پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ اس اثناء میں شگوفہ کے کئی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ شگوفہ سارے ملک میں طنز و مزاح کا واحد نمائندہ رسالہ ہے جس کے ذریعہ بے شمار نئے نئے لکھنے والوں نے مزاحیہ ادب میں اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ شگوفہ کی شہرت صرف ہندوستان کی حد تک محدود نہیں رہی۔ اب تو اسکا شہرہ تمام اردو دنیا میں ہوچکا ہے۔ مصطفےٰ کمال نے اس رسالہ کی بقاء و ارتقاء کے لئے اپنی [illegible] توانائیاں صرف کی ہیں۔ مجلسِ مشاورت [illegible] سے

وابستہ تمام صرف اپنی وضع داری کی حد تک رہ گئے ہیں۔ پرچہ کا سارا کام صرف اور صرف مصطفےٰ کمال کرتے ہیں۔ کالج کی اہم مصروفیات، مختلف اداروں کی سرگرمیاں اور گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود شگوفہ کے کام میں وہ کبھی تساہل سے کام نہیں لیتے۔

ڈاکٹر مصطفےٰ کمال پر وضع داری کی چھاپ اس قدر گہری ہے کہ "جان جائے پر وچن نہ جائے" کے مصداق، نقصان کے باوجود بھی شگوفہ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ مصطفےٰ کمال بھی میرے اُن شریف النفس، محبت شناس اور وفاشعار دوستوں میں سے ایک ہیں جن سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اظہارِ خیال کے معاملے میں ایسے پاک و صاف، ایماندار لوگ جن کے ہاں ذہنی تحفظات نہ ہوں مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ مصطفےٰ کمال کی زندگی کا اپنا ایک نصب العین ایک نظریہ ہے۔ وہ اپنے لئے راستہ خود بناتے ہیں، کسی کے نقشِ قدم پر چلنا یا کسی کے نقشِ قدم کو مٹاتے ہوئے گذرنا انہیں پسند نہیں۔ وہ اپنے راستے میں کسی کو حائل ہونے نہیں دیتے لیکن اتنے فراخ دل بھی ہیں کہ وہ اپنے ساتھ چلنے والے کا راستہ نہیں روکتے مصطفےٰ کمال کی باشعور زندگی اُردو زبان و ادب کے لئے ایک ایسا سنگ میل ہے جو نئے پرانے راہ رو کو چلتے رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مصطفےٰ کمال کی شخصیت کی پرچھائیاں جس پر بھی پڑی ہوں گی وہ کارزارِ حیات میں رواں دواں رہا ہوگا۔ اُن کی شخصیت کا رعب ہر پہلے واسطے کو ملنے والے کو بے تکلف ہونے نہیں دیتا، لیکن مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ بے تکلف فضاؤں ہی میں گفتگو کرتا رہتا ہوں لیکن ہماری گفتگو جمالیات اور ادبِ عالیہ کے دائرہ سے آگے نہیں بڑھتی۔ جب کبھی ذہنی تھکن محسوس کرتا ہوں تو شگوفہ کے دفتر بے ارادہ

نظر اُٹھ جاتی ہے۔ مصطفےٰ کمال کی جمالیاتی گفتگو کے کچھ الفاظ کانوں میں رس ٹپکاتے رہتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ میں بے خیالی میں شگوفہ کے دفتر پہنچ جاتا ہوں۔ کچھ اُن سے سنتا ہوں اور کچھ اپنی سناتا ہوں، ایک دوسرے کے ہلکے سے تبسم میں وہ تمام مراحل طے ہو جاتے ہیں جو دل گداز کا ناقابلِ فراموش سرمایہ ہوتے ہیں۔ --

بھیگی ساعتوں کا مسافر

فیض الحسن خیالؔ

یہ ممکن ہے کہ انسان سب کچھ بھول جائے مگر اُن اولین ساعتوں کو نہیں بھول سکتا، جن کا دوستی و روابط کی اولین محسوسات سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ جب انسان اپنی عملی زندگی کے راستوں میں تیزی سے قدم بڑھاتا رہتا ہے تو نت نئے حادثات و تجربات سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ کھرے کھوٹے کو پرکھتے ہوئے اندھیروں' اُجالوں کے تجربوں سے گذرتا ہے تو زندگی اپنی تکمیل کی طرف رواں دواں ہو جاتی ہے۔

فیض الحسن خیالؔ سے میری دوستی، عمر کے اُس حصہ میں ہوئی جب شعور کی منزل، راستوں کی نشان دہی کرتے ہوئے مستقل مزاج راہ رو کی منتظر رہا کرتی ہے۔ فیض الحسن خیالؔ کو میں نے پہلی بار اُس وقت دیکھا جب وہ بھی میری طرح پیرا ڈائز انسٹی ٹیوٹ میں پرائیوٹ اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے علی گڈھ میٹرک کی تیاری کر رہے تھے۔ خیالؔ نے بھی علی گڈھ میٹرک کی تیاری کے لئے اُس وقت کے سب سے مشہور پیرا ڈائز انسٹی ٹیوٹ کا انتخاب کیا تھا جہاں سے ہر سال طلباء و طالبات کو امتحان دینے کے لئے علی گڈھ بھجوایا جاتا تھا۔

میں جس ٹرین سے اپنے دیگر ساتھی طالب علموں کے ساتھ علی گڑھ جارہا تھا، اسی ٹرین میں فیض الحسن خیالؔ بھی تھے۔ غالباً اٹارسی یا جھانسی کے قریب ہم دونوں میں پہلی بار گفتگو ہوئی۔ خیالؔ، اپنے دوستوں نواب جنید اللہ خاں اور افسر نواب (فرزند نواب، دوست خاں) کے ساتھ تعلیمی تاش کھیل رہے تھے۔ خیالؔ کی خواہش پر میں بھی شریک ہوگیا۔ اس گروپ کا تقریباً ہر طالب علم باری باری سے فلمی گانا گاتا رہا۔ جب خیالؔ کی باری آئی تو میں نے دیکھا کہ خیالؔ نے لوٹے میں منہ ڈال کر گانا شروع کیا۔ خیالؔ کی آواز سے سارا کمپارٹمنٹ گونجنے لگا

جب ہم علی گڑھ پہنچے تو ہمیں انتظامیہ کی جانب سے یونیورسٹی سے متصل ممتاز بلڈنگ میں ٹھیرایا گیا۔ ابتدا میں ہمارے خورد و نوش کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا گیا تھا لیکن خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے احتجاجاً ہم نے علحدہ انتظام کروایا۔ گروپ لیڈر کی حیثیت سے میں (صلاح الدین نیر)، فیض الحسن خیالؔ اور بشمبر دیال اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا کرتے تھے۔ امتحان کی تیاری ہم ساتھ ساتھ کرتے تھے۔ امتحان کے دوران چھٹیوں میں ہم نے دلی، تاج محل اور فتح پور سیکری کا پروگرام بنایا تھا۔ اس تفریحی ٹور میں ہم ساتھ ساتھ رہے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران ایک گروپ بنا کر ہم ایک مخصوص ہوٹل میں ہر روز ۸ بجے شب چائے پینے کے لئے جایا کرتے تھے۔ جہاں علی گڑھ یونیورسٹی کے ہاسٹل سے وابستہ طلبا خوش گپیوں میں مصروف دکھائی دیتے۔ اُس زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء حیدرآبادی طلبا پر ناپسندیدہ جملے کستے تھے۔ جب ہم پر بھی کچھ طلبا نے تجربہ کرنا چاہا تو انہیں اپنا تجربہ مہنگا پڑا اور ایک بڑا جھگڑا مصالحت پر

ختم ہوگیا۔ جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو ہم دونوں پاس ہوگئے۔ علی گڈھ سے واپسی کے بعد خیالؔ سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی تھی۔ میٹرک کے بعد میں پرائیوٹ طالب علم کی حیثیت سے انٹرمیڈیٹ (مدھیہ پردیش) کی تیاریوں میں مصروف رہنے لگا۔ خیالؔ نے ایک ملاقات میں کہا کہ انہیں شاعری کا شوق ہے وہ شعر کہتے ہیں۔ میں اُن دنوں منشی فاضل (پرشین گریجویشن) کی تکمیل کررہا تھا۔ اُردو کے اساتذۂ سخن کے اچھے اچھے شعر یاد کرنا میرا شوق تھا۔ ادارۂ اشاعت العلوم کے بانی استاد المحترم مولانا کلیمی نے منشی فاضل کے طلباء کو شعر گوئی کے فن سے واقف کروایا۔ مولانا کلیمی طلباء سے شعر گوئی کی مشق کرواتے۔ ایک دن خیالؔ نے مجھ سے کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں کسی استاد کو دکھانا چاہیئے۔ اُن دنوں خیالؔ کے ایک شاعر دوست افضل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے خیالؔ کو اور مجھے مشورہ دیا کہ ہم اپنا کلام اُس وقت کے مشہور شاعر اوجؔ یعقوبی کو دکھلائیں۔ اِس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہم مشاعروں میں شرکت کرسکیں گے۔ ہمیں مشاعرے میں کلام سنانے کا موقع ملتا رہے گا۔ افضل صاحب کی بات ہمیں پسند آئی اور ہم نے اوجؔ یعقوبی صاحب کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ اُس زمانے میں اوجؔ صاحب مغل پورہ کمان سے متصل ایک بلڈنگ میں واقع اپنے دوست کی ہوٹل میں منیجر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اوجؔ یعقوبی صاحب کو کلام دکھانے کے بعد ہم باضابطہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ اُن دنوں ہم ایک اور ماہر علم عروض استاد شاعر علامہ قدرؔ عریضی کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ جب اوجؔ صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ ہم قدرؔ عریضی صاحب کو بھی کلام دکھاتے ہیں تو انہیں ناگوار گذرا۔ اُس زمانے میں ایک سعادت یہ بھی تھی کہ

ایک استاد کے شاگرد کا دوسرے استاد کو کلام دکھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس کشمکش میں ہم دونوں نے دونوں اساتذہ کو کلام دکھانا ترک کردیا اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنے اشعار کا خود جائزہ لے کر مشاعروں میں کلام سنانے لگے۔ اوجؔ صاحب کی اصلاح کا طریقہ یہ تھا کہ ہم تازہ کلام اُن کے حوالے کرتے وہ دوسرے یا تیسرے دن بعد اصلاح ہمیں لوٹا دیتے۔ اوجؔ صاحب ضرورت محسوس ہو تو ایک دو لفظ بدل دیتے اور اگر کوئی مصرعہ ساقط البحر ہو تو درست کرتے۔ ہمیشہ یہ کہتے کہ خود اعتمادی کی فضاء میں شعر کہتے رہو۔ برخلاف اوجؔ صاحب کے قدرؔ عریضی صاحب اصلاح کلام کے لئے ہفتہ میں کوئی ایک دن مقرر کرتے۔ قدرؔ صاحب نے ہمیں فی البدیہہ شعر کہنے کی تربیت سے بھی نوازا۔ کوئی ایک مصرعہ طرح دیتے اور اپنے کام میں مصروف رہتے۔ نصف گھنٹہ کے بعد ہم سے کاغذات لے لیتے اور اسی وقت ضروری اصلاح دیتے۔

ابتدائی شاعری کا دور ہر شاعر کے لئے ایک مشق کا دور ہوتا ہے۔ میں نے بھی مشق کے طور پر بے شمار شعر کہے تھے لیکن جب پہلے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی منزل آئی تو میں نے ابتدائی مشق کے زمانے کے تمام اشعار کو منسوخ کردیئے۔ پہلے کے اساتذہ بعض اپنے شاگردوں کو شعری تربیت کے ساتھ ساتھ آدابِ محفل کے رموز و نکات سے بھی واقف کرواتے تھے۔

مشاعروں کی معرفت؛ فیض الحسن خیالؔ سے میری دوستی کی بنیاد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ آج بھی ہم مثالی اور بہترین دوست ہیں۔ رئیس اختر اور دیگر خاص دوستوں کی طرح فیض الحسن خیالؔ بھی میرے دل کی خوشگوار دھڑکنوں کا

ایک حصہ بنتے ہوئے ہیں۔ میرے شاعر دوستوں میں فیض الحسن خیالؔ کو اولیت حاصل ہے۔ پھر ان کے بعد شاعر دوستوں کی فہرست میں رئیس اختر، ڈاکٹر صادق نقوی، ناصر کرنولی، رحمٰن جامی، ساجد رضوی، اکمل حیدرآبادی، عثمان علی ضیاء جیسے اور بھی شاعروں کا اضافہ ہوتا گیا۔ ہماری حوصلہ افزائی کرنے والے اساتذۂ سخن میں علامہ نجم آفندی، مولانا شیخن احمد شطاری کامل، حضرت تاج قریشی، حضرت سیف حموی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

جب میں اُردو کالج کا طالب علم تھا، اُس زمانے میں اُردو مجلس شباب پر تھی منظور احمد منظور معتمد اُردو مجلس نے اُردو مجلس کی سرگرمیوں کو بامِ عروج پر پہونچا دیا تھا۔ اُردو کالج اور سیاست سے وابستگی کے بعد میری شاعرانہ زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔ ایسا لگا کہ میں نئی روشنی اور تازہ ہوا میں آگیا ہوں۔ نئے نئے لوگوں نئی نئی محفلوں سے روشناس ہوتا گیا۔ نئی جگہ اور نئے ماحول نے دل کھول کر میری پذیرائی کی۔ یوں محسوس ہوا کہ اپنی شخصیت کو بنانے اور نئی شناخت کی آبیاری کے لئے ایک وسیع میدان میرا منتظر ہے۔ نئے شہر کے شاعرانہ ماحول نے مجھے علامہ حیرت بدایونی، شاہد صدیقی، مخدوم محی الدین، خورشید احمد جامی، سلیمان اریب اور دیگر شاعروں کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس دور کے ہندی شاعروں میں راجہ دوبلے اوم پرکاش نرمل اہم نام تھے۔

فیض الحسن خیال، ابتدا ہی سے خوش لباس شاعر کی حیثیت سے پہچانے گئے۔ خیال کے کلام سنانے کا انداز منفرد ہے، اُن کے ترنم کی نقل مشکل ہے۔ خیال کو بھی مشاعروں میں توجہ سے سُنا جاتا ہے۔ میرے دیگر ساتھی شاعر دوستوں

کی طرح خیالؔ بھی برسوں سے آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن سے اپنا کلام اہلِ ذوق تک پہونچا رہے ہیں۔

خیالؔ صاحب کے دوستوں کا حلقہ اتنا وسیع نہیں ہے کہ ہم نئے نئے دوستوں سے خود کو بھی متعارف کرواسکیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب کچھ اچھے دوست میسر ہیں تو انہیں پر قناعت کرنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی محفلوں میں اُس وقت تک خیالؔ کو بھی یاد کیا جاتا رہے گا جب تک میری پہچان باقی ہے۔

■■

خوش گو، خوش گلو اور خوش مزاج شاعر

اکملؔ حیدرآبادی

ذہن پر کافی بار ڈالنے پر بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ اکملؔ حیدرآبادی سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں تنہا شہر کے نوجوان شاعروں میں صرف اور صرف ایک ہی ایسا شاعر تھا جو مشاعروں اور تہذیبی پروگرامس کے انعقاد میں دلچسپی لیتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے صرف دو ملاقاتیں یاد آرہی ہیں۔ ایک تو خود اکمل کے گھر کی ملاقات، جبکہ اُن دنوں شکیلؔ بدایونی، حسرتؔ جے پوری، خمارؔ بارہ بنکوی، صباؔ افغانی وغیرہ حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور جن کا قیام اکمل کے گھر واقع ریڈ ہلز پر تھا۔ شکیلؔ بدایونی جب بھی حیدرآباد آتے اکمل ہی کے مکان میں ٹھہرتے تھے۔ اکمل سے دوسری ملاقات ایک کل ہند مشاعرہ کے سلسلے میں ہوئی تھی جو ۳۰ برس پہلے (۱۹۶۰ء) نمائش کلب کے آفس کے سامنے کے میدان میں منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ میں شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، صبا افغانی اور حسرت جے پوری نے شرکت کی تھی۔ میزبان شاعروں میں شاہد صدیقی کے علاوہ مشہور و مقبول شعراء نے کلام سنایا تھا۔ جونیئر شاعر کی حیثیت سے میں نے

بھی اس مشاعرہ میں غزل پڑھی تھی۔ اکمل ریلوے میں ملازم تھے۔ اکمل نے ۱۹۶۱ء میں بمبئی میں تبادلہ کروالیا پھر وہاں فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئے۔ اکمل بمبئی میں ۱۵ - ۱۶ برس رہے۔ اس اثنا میں وہ حیدرآباد بہت کم دنوں کے لئے آتے رہے مجھ سے بھی کم کم ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اکمل کو جب اپنے مالیہ کو مستحکم کرنے کا خیال آیا تو وہ بمبئی سے دوبئی چلے گئے وہاں تقریباً ۷، ۸ سال مقیم رہے، اپنی صلاحیت کے بموجب روپیہ کمایا، کچھ بچت کی۔ لڑکوں کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ جب دوبئی سے جی بھر گیا اور دوبئی میں اتنا روپیہ کما لیا کہ آرام سے اپنے وطن میں کوئی کاروبار کیا جا سکتا ہے تو یہ احساس ہوا کہ کیوں نہ اپنے وطن لوٹ جائیں۔ چنانچہ دس برس سے اکمل حیدرآباد میں ہیں اور روزی روزگار سے لگے ہوئے ہیں۔ زیادہ وقت اپنے بزنس میں دیتے ہیں۔ الحمدللہ اکمل اپنی سخت محنت اور مسلسل جانفشانی سے اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے میں لگے ہیں۔

دوبئی سے حیدرآباد آنے پر اکمل سے میری ملاقات دفتر سیاست میں ہوئی۔ میں نے جب شعروادب کی محفلوں میں شرکت کے لئے درخواست کی تو اکمل نے جواب دیا۔ ”پیارے اول طعام بعدہٗ کلام“۔ جواب معقول تھا۔ کچھ دن خاموش رہا لیکن انہیں زیادہ دنوں تک ادبی محفلوں سے دور نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اکمل نے یہی کہا کہ ذرا اچھی طرح جم جانے دو، مشاعروں کیلئے عمر پڑی ہے۔ محفلوں میں آتا رہوں گا۔ زندگی سے لڑ رہا ہوں، حالات سے مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی کچھ ہی دنوں بعد

اپنے دوستوں کی محفلوں میں دوبارہ آتا رہوں گا۔

اکمل حیدرآبادی اور اُن کے چند ہم خیال اہلِ قلم نوجوان دوستوں نے ۲۵ سال قبل ینگ پوئٹس اسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی تھی میں بھی اُس اسوسی ایشن سے وابستہ تھا۔ اُس زمانے میں لکھنے والے نوجوانوں کا ایک بہت بڑا گروپ تھا لیکن نظریاتی اختلافات کی وجہ سے قلم کار دو گروپ میں بٹ گئے، اور آج بھی وہ گروپ بٹے ہوئے ہیں لیکن ہر دو گروپ کے شاعر و ادیب اپنی اپنی سطح پر ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اکمل کی یہ خوبی ہے کہ وہ دونوں گروپس سے اپنے تعلقات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ممتاز صحافی جناب محبوب حسین جگر، اکمل کو بہت چاہتے ہیں، اکمل بھی جگر صاحب کا دل کی گہرائیوں کے ساتھ احترام کرتے ہیں۔ اکمل ایک بے غرض، مخلص ترین دوست کی طرح برسوں پہلے قائم کئے ہوئے دوستانہ روابط کو سلیقے سے نبھا رہے ہیں۔ نظم اور نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ روزنامہ سیاست کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ان کا کلام اہلِ ذوق اصحاب تک پہونچ جاتا ہے سیاست میں تبصرے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے دوستوں میں ہر مکتبِ خیال کے شاعر و ادیب ہیں۔ اکمل نے ان ۳۰ برسوں میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن تا حال انہوں نے ایک بھی مجموعۂ کلام شائع نہیں کیا، جس کی اشاعت کا ہمیں برسوں سے انتظار ہے۔ اکمل کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے ان کی ایک ضخیم تحقیقی کتاب " فنِ قوالی امیر خسرو سے تشکیلہ بانو تک "۔ یہ کتاب ایک دستاویزی شکل رکھتی ہے۔ چھ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب اس مخصوص

موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تزئین اور اس کے خدوخال کو سنوارنے میں اکمل نے کئی برس گذارے۔ ترنم سے شعر سناتے ہیں۔ ان کا ترنم شکیل بدایونی سے ملتا جلتا ہے۔ ہماری ملاقاتوں کا واحد اہم ذریعہ شعروادب کی محفلیں ہیں۔ اکمل حتی الامکان شہر کی اہم ادبی محفلوں میں شرکت سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ادب کے تقریباً ہر موضوع پر اظہار خیال کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

میں اپنے شاعر دوستوں کی پہلی فہرست میں اکمل حیدرآبادی کا نام دیکھ کر بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میری یہ دیرینہ خواہش تھی کہ جب کبھی بھی اپنے بعض قریبی دوستوں کے بارے میں لکھوں گا تو اکمل کو بھی اسی اعزاز سے پیش کروں گا جس کے وہ مستحق ہیں ▬▬

سیماب صفت ادیب و نقاد

ڈاکٹر طیب انصاری

مجھے اپنی ادبی زندگی میں کچھ ایسی اہلِ قلم شخصیتوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جنھوں نے اپنی عمدہ ادبی و تنقیدی صلاحیتوں کی بناء پر شعر و ادب کی دنیا میں اپنے لئے خود جگہ بنالی ہے۔ عام لوگوں ہی میں کچھ خاص لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن جب ایسے خاص لوگوں کی بھی تعداد گھٹنے لگتی ہے تو اُن میں سے کچھ مخصوص شخصیتیں ہی دوستوں کی صفوں میں باقی رہ جاتی ہیں، پھر رفتہ رفتہ دوستوں کی فہرست گھٹتے گھٹتے کچھ دوستوں تک محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔

زندگی کے سفر میں یوں تو بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوجاتی ہے لیکن کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی ملاقات دوستی میں بدل جاتی ہے۔ ویسے بھی دوستوں کی فہرست میں کچھ ہی نام ایسے ہوتے ہیں جو زیادہ عرصہ تک یاد رکھے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ مجھے جتنے بھی اچھے دوست ملے وہ اپنی پوری شناخت کے ساتھ ملے جو میرے لئے ایک اعزاز ہے۔

طیب انصاری میرے اُن ہی دوستوں میں سے ایک ہیں جن کے مزاج کی بے ساختگی، خوش گفتاری تیز روی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ میں نے اپنے

دوستوں کا جائزہ لیتے ہوئے کبھی یہ نہیں سوچا کہ معاشرہ کی ہر سطح پر کون کس مقام پر ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے صرف یہ دیکھا ہے کہ اُس مخصوص شخص کا مجھ سے کس طرح کا سلوک ہے۔ یوں بھی میں نے ہر دوست کو اس کے مخصوص رویوں اور اس کے مزاج کی دلکشی کے ساتھ قبول کیا ہے۔

طیب انصاری، زائد از ۲۰ برسوں سے میرے دوستوں کی فہرست میں اپنی پوری انفرادیت و پہچان کے ساتھ شامل ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اُن سے میری پہلی ملاقات دفتر سیاست میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ کچھ دنوں کے لئے ایڈیٹوریل سکشن سے وابستہ رہے۔ طیب انصاری ایک باصلاحیت، باشعور، محنتی اور تیز رفتار راہ رو کی طرح ادیبوں کی صف میں داخل ہوئے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے اپنی تحریری و تقریری صلاحیتوں کی بناء پر ادبی حلقوں میں اپنا مقام بنانا شروع کر دیا تھا۔ لکھنے پڑھنے کے شوق نے انہیں یکے بعد دیگرے کئی کتابوں کا مصنف و مولف بنا دیا ہے۔ طیب انصاری جہاں ایک اچھے نثر نگار ہیں وہیں وہ ایک اچھے نقاد، محقق، مبصر و مقرر ہیں۔ ادب کے ہر موضوع پر ماہرانہ اظہارِ خیال کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کثرتِ مطالعہ نے اُنہیں ایک مستند ادیب کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اہم مقام عطا کیا ہے۔ ان کی پہلی تصنیف "تحریر و تنقید" نے سارے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ ادبی حلقوں میں ان کی شناخت کیلئے یہ پہلی کتاب سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچیکہ اس کتاب کی اشاعت پر مثبت و منفی دونوں طرح کے تبصرے ہوتے رہے لیکن اس پہلی تصنیف نے اہلِ علم و ادب کو طیب انصاری کے بارے میں سوچنے کے لئے مجبور کیا۔ طیب انصاری کی تاحال

حسبِ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو شعر و ادب و صحافت کے مختلف موضوعات پر محیط ہیں۔ تحریر و تنقید۔ ادراکِ معنیٰ ۔ میرا شہر میرے لوگ ۔ یارانِ شہر۔ قطبِ دکن ۔ سوانح العمری حضرت علاء الدین انصاری (دونوں مشترکہ تالیفات) تصوف کی شاعری، خانقاہی نظام۔ حیدرآباد میں اُردو صحافت ۔ آباد حیدرآباد ۔ نذرِ علاء ۔ قطب مشتری (مقدمہ) گلبرگہ سے گلمرگ تک اور داستانِ ادب، گلبرگہ۔

جیسا کہ میں نے پچھلی سطروں میں کہا ہے کہ طیب انصاری جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لئے سیاست سے وابستہ رہے۔ طیب نے سیاست سے اپنا تعلق کسی نہ کسی طرح آج تک برقرار رکھا ہے۔ پھر وہ لکچرر اُردو کی حیثیت سے گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج گلبرگہ میں ملازم ہو گئے (اب صدر شعبۂ اُردو ہیں)۔ گلبرگہ میں ملازمت کے باوجود طیب نے حیدرآباد کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے اپنا تعلق برقرار رکھا ہے۔ ایک خود اعتماد ادیب کی طرح اُن کا ادبی رویہ کبھی مجلہ بندی کا ہی سمجھوتے کے تابع نہیں رہا۔ وہ پوری جرأت و حوصلہ کے ساتھ اپنے نظریۂ ادب کو پیش کرتے ہیں۔ طیب نے گلبرگہ کی علمی و ادبی فضاء کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ کئی نوجوان اہلِ قلم کی سرپرستی و حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نہ صرف اُن کی شخصیت کو اُبھارا ہے بلکہ انھیں با اعتماد فضاء میں اپنا مقام بنانے کا حوصلہ بخشا۔

طیب انصاری چونکہ خانقاہی نظام کے پروردہ ہیں اس لئے بزرگوں کی عزت و احترام کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ مزاج میں اگرچہ کہ بذلہ سنجی و ظرافت ہے، گفتگو میں طنز کے نشتر بھی ملتے ہیں لیکن سنجیدگی

کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

طیب انصاری نے عملی طور پر اس بات کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ حیدرآباد سے دور ہیں، انہوں نے حیدرآباد سے خاص طور پر اپنے ادبی رشتہ کو کچھ اس طرح باقی رکھا ہے کہ بیشتر ادبی جلسوں، سمیناروں اور سمپوزیم میں اُن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ حیدرآباد کی تقریباً ہر انجمن کے عہدیداروں سے اُن کی اچھی خاصی جان پہچان ہے۔ ہر مکتبِ خیال کے شاعر و ادیب سے اُن کی رسم و راہ ہے۔ معاشرہ کی اہم شخصیتوں سے اُن کی صاحب سلامت اور پہچان کا ثبوت، سوسائٹی کی اولین فہرست میں نمایاں جگہ پر ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی ذاتی محنت اور لگن سے دیارِ شعر و ادب میں اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا ہے۔

مجھے اپنی زندگی میں زیادہ تر پُر خلوص دوست ہی ملے جن سے روابط میرے اطمینانِ قلب کا باعث ہیں۔ جب بھی کوئی شخص میرے دوستوں کی فہرست پر نظر ڈالے گا تو اُسے بیک نگاہ، طیب انصاری کا نام نمایاں نظر آئے گا۔

==

○

دلوں کو جوڑنے والا شاعر

نیہپال سنگھ ورما

حیدرآباد کے ہندی کے اہم شاعروں میں آج ایک ایسا بھی نام سرِفہرست ہے جو صلاح الدین نیّر کے نام کے ساتھ یا اُس نام کے ساتھ صلاح الدین نیّر کا نام لکھا ہوا ملے گا، اور وہ نام ہے نیہپال سنگھ ورما کا۔

سچ پوچھئے تو حیدرآباد میں ہندی، اُردو کو قریب لانے میں گذشتہ ۱۸، ۲۰ سال سے نیہپال سنگھ ورما نے جو کارنامے انجام دے رہے ہیں وہ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب، صدیوں کی رواداری و بھائی چارگی، برسوں کی لسانی ہم آہنگی اور اخلاقی اقدار کے تحفظ و ضمانت کے لئے ناقابلِ فراموش ہی نہیں ہیں بلکہ شہر کی ادبی و تہذیبی تاریخ میں یقیناً روشنائی سے لکھے جائیں گے۔

ورما کا نام شہر حیدرآباد کی ہر شائستہ اور پُروقار محفل میں عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ معاشرے میں یوں تو قابلِ رشک و لائقِ تحسین بہت سے لوگ مل جائیں گے لیکن ایسے لوگ کم ملیں گے جن کے جینے کا مقصد ہی اپنے لئے کم اور دوسروں کے لئے زیادہ ہو اور جن کے صبح و شام آس پاس کے لوگوں کی بہتر زندگی اُن کے علمی، ادبی و ثقافتی کاموں کے لئے بادِ صبا کے لہراتے ہوئے آنچل کی طرح معطر ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے پنہیال سنگھ ورما کو ۳۰ سال پہلے انوار العلوم ویمنس کالج (پرانی حویلی) کے ایک مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ وہ شاذ تمکنت کے ہمراہ آئے تھے (لیکن کافی دیر بعد) اس مشاعرہ میں ورما صاحب نے بھی کلام سنایا تھا۔ اُس وقت ویمنس کالج کی پرنسپل محترمہ تسنیم یزداتی تھیں۔ میں اُن دنوں اُردو کالج میں بی۔او۔ایل کا طالب علم تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ حیدرآباد کے ایک کم آمیز شاعر نواب لیسین علی خاں نے جو زائد از ۲۵ سال پہلے حیدرآباد سے لندن کے لئے روانہ ہوئے تھے) مجھ سے فون پر اس مشاعرہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پرنسپل انوار العلوم ویمنس کالج مسز یزدانی' مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے پرنسپل صاحبہ سے فون پر ربط قائم کیا۔ اُنہوں نے کالج آنے کی مجھ سے خواہش کی۔ ملاقات کے بعد مشاعرہ کے انعقاد کے سلسلے میں مشاورت رہی۔ محترمہ رفیع رؤف اُس کالج میں اُردو کی لکچرر تھیں۔ پرنسپل صاحبہ نے اُنہیں بلایا۔ رسمی تعارف اور چائے نوشی کے بعد میں نے مشاعرہ کی ذمہ داری قبول کی۔ حیدرآباد کے نمائندہ شعراء کی فہرست ترتیب دی گئی۔ تمام مدعو شعراء نے اپنے بہترین کلام سے مشاعرہ کو ایک دستاویزی و تاریخی شکل عطا کی۔ یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بھی ایک یادگار مشاعرہ ثابت ہوا۔ اس مشاعرہ میں صرف انتظامیہ کالج کی اساتذہ اور طالبات نے شرکت کی تھی۔

اُس دور کے مشہور ہندی شاعروں راجہ دوبے، اوم پرکاش نرمل، دولی چند شششی اور کالی چرن گپتا راہی سے میں واقف تھا۔ اُس زمانے میں بھی کہیں کہیں ہندی، اُردو کے ملے جلے مشاعرے ہوتے تھے لیکن اُن مشاعروں کی حیثیت باضابطہ

مشاعر... س ہوتی تھی۔ تنہیال سنگھ ورما صاحب اِس میدان میں اُترے تو مشاعروں کی نوعیت ہی بدل گئی۔ انہوں نے اپنی شخصی دلچسپی کی وجہ سے ہندی اُردو کے شاعروں کو ایک مرکز پر جمع کرنا شروع کیا۔ میں اِس پرخلوص اور ایک اچھے کام میں ان کا ایک مخلص ساتھی ثابت ہوا۔ میں بھی اپنے زیرِ انتظام مشاعروں میں ہندی کے شاعروں کو مدعو کرتا رہا۔ شہر میں ایسے ملے جلے مشاعرے ہم دونوں کی مشاورت سے منعقد کئے جانے لگے۔ تنہیال سنگھ ورما اپنی دو انجمنوں ہندی لیکھک سنگھ اور گیت چاندنی کے ذریعہ آج بھی عملی ثبوت دے رہے ہیں۔ اِس پسندیدہ طریقۂ کار سے شہر کی ادبی فضاؤں میں ایک اچھا خاصا صحت مند ماحول پیدا ہوا ہے۔ سارے ملک میں حیدرآباد ہی وہ واحد شہر ہے کہ یہاں اردو ہندی کے ملے جلے مشاعرے اور ادبی محفلیں شہر کی عمدہ روایات کے تسلسل میں بہ حسن و خوبی منعقد کی جا رہی ہیں۔

ورما صاحب کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُن کی شخصی کوشش سے یہاں نئے نئے ہندی شاعر و ادیب روشناس ہوئے ہیں کہنہ مشق شاعر و ادیب، اپنی شرکت اور سرپرستی سے محفلوں کی زینت بڑھا رہے ہیں۔

ورما جہاں ایک معتبر شاعر ہیں وہیں بہترین نثر نگار، باشعور تبصرہ نگار اور بہترین مقرر بھی ہیں۔ وہ ایک ایسے انسان ہیں جو زندگی کی راحتوں و آسائشوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ بھی اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔

تنہیال سنگھ ورما کو ہندی ادبیات پر کما حقہ عبور حاصل ہے۔ اسی طرح وہ اُردو ادب و تاریخ، تنقید و تحقیق کے تمام تر شعبوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اُردو شعر و ادب کی مجالس میں ورما قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ورما کی شخصیت ہی کچھ ایسی

پُرکشش ہے کہ اُن سے پہلی بار ملنے والا شخص دوسری ملاقات کا انتظار کئے بغیر اپنے روابط کو استحکام بخشتا ہے۔ ورما کا یہ وصف اُن کی ہر دل عزیزی، شہرت و مقبولیت کو بلندی پر پہونچانے کے لئے کافی ہے۔ کچھ ایسی ہی خوبیوں کی وجہ سے ہندی، اُردو والے اُنہیں اپنا شاعر، اپنا ادیب اور اپنا دوست سمجھتے ہیں اور ان سے روابط اور دوستی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے حلقۂ احباب میں زیادہ تر وہ لوگ دکھائی دیتے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی نیک نامی کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ بقید حیات اُن کے اُردو شاعر دوستوں میں صلاح الدین نیّر، رئیس ماجد، رحمٰن جامی، ڈاکٹر صادق نقوی، تاج کرنولی، فیض الحسن خیال، صادق نوید، عزیز بھارتی، مستان منظر، مومن خاں شوق کچھ زیادہ ہی نمایاں ہیں۔ تعلقات و روابط کو استوار رکھنا ورما کی زندگی کے اہم پہلو ہیں۔ ورما ایک معتبر، شائستہ، روشن خیال، بے تعصب اور کھلا ذہن رکھنے والے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ہمدرد و پُرخلوص انسان بھی ہیں۔ معاشرہ کی نمائندہ شخصیتوں سے بھی ان کے مراسم ہیں۔ رسم و راہ کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ نہایت سلیقے اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے تعلقات کو برقرار رکھنے کی صلاحیت ان میں موجود ہے۔ علمی، ادبی، تہذیبی و فلاحی خدمات کے اعتراف میں شہر کے مختلف اداروں کی جانب سے اُنھیں ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ حکومت کے تہذیبی اداروں کی جانب سے بھی ان کا سمان کیا گیا ہے۔

ورما کی شاعری دل پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ قومی یک جہتی، ظلم و تشدد، حق تلفی اور فرقہ وارانہ جنون کے موضوع پر اُنہوں نے بہت سی کامیاب نظمیں کہی ہیں۔ زائد از تین دہوں سے شعر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری کی زبان عام فہم ہے۔ ہندی کے

تمام شاعروں میں یہ پہلے شاعر ہیں جنھیں اُردو مشاعروں میں خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن سے اپنا کلام عوام تک پہونچاتے ہیں۔ کئی اُردو، ہندی کے کوی سمّیلن مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ملک کے حالیہ فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر اُنہوں نے "میرا بھارت مہان" کے زیرِ عنوان ایک کامیاب نظم لکھی ہے۔

نیپال سنگھ ورما زائد از ۳۰ سال سے انوار العلوم کالج میں ہندی کے استاد ہیں، اُنہیں صدر شعبۂ ہندی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انوار العلوم کالج کا انتظامیہ نیپال سنگھ ورما کی خدمات کا کھلے دل سے معترف ہے۔ انتظامیہ، اساتذہ، اسٹاف اور طلباء و طالبات میں ورما قدر و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ کالج کی ارتقائی منزل کو زیادہ سے زیادہ بامقصد بنانے میں دیگر اساتذہ کے ساتھ ساتھ ورما کی دیانت داری، دلچسپی اور کارکردگی کا بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ صدر نشین مجلس انتظامیہ نواب شاہ عالم خاں، اور سکریٹری مجلس انتظامی نواب محبوب عالم خاں ورما صاحب کی بے حد قدر کرتے ہیں اور کالج کے لئے ورما کے وجود کو ایک بہترین اثاثہ سمجھتے ہیں۔

ہر انسان کی زندگی میں یوں تو کئی لوگ آتے اور جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کے تجربات کا حاصل سمجھے جاتے ہیں۔ اچھے انسان اور اچھے دوست کا ملنا صرف اللہ کی مہربانی پر منحصر ہے۔ ورما ایک ایسے پُرخلوص انسان ہیں جن سے مل کر ایک عام آدمی بھی اُن کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ ورما بھی زندگی کی حرارت محسوس کرنے والے اُن لوگوں میں سے ایک ہیں جو آنے والے کل کا انتظار نہیں کرتے۔ میں نیپال سنگھ ورما کی دوستی پر اس لئے بھی فخر کرتا ہوں کہ ایسے بے غرض بے لوث دوست قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔

— —

سُبک خرام، نرم گفتار، باشعور شاعر

منّان منظور

اگر ہم اپنے روز و شب کا سنجیدگی سے ساتھ جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بعض لوگ زندگی کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بھی اپنی شخصیت کے خد و خال کو ظاہر ہونے نہیں دیتے۔ برسوں گزر جائیں گے لیکن روابط میں اگر تشکیک کا پہلو ہوگا بھی تو وہ کہیں نہ کہیں سے نمایاں ہوگا۔ معاشرہ میں ایسے بھی کچھ لوگ پائے جاتے ہیں جو کبھی کبھی ہونے والی ملاقاتوں میں اپنے ظاہر و باطن کو ایک ہی شکل و صورت میں پیش کرتے ہوئے اپنے پاکیزہ کردار اور آئینہ صفت ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ میں نے منّان منظور کو ایک ایسے ہی رنگ میں پایا ہے۔ گزشتہ ۵، ۶ سال کی رفاقت میں، کبھی بھی، کہیں بھی، کسی وقت بھی میں نے اُن کے کردار میں کسی قسم کا جھول نہیں پایا۔

منّان منظور ایک سُبک خرام، نرم گفتار اور باشعور شاعر ہونے کے علاوہ بے حد مخلص انسان ہیں، جن سے دوستی کرتے ہوئے کم از کم مجھے تو فخر محسوس ہوتا ہے۔ جو شخص اپنی خودداری اور اپنی انا کو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتا ہو میں ایسے شخص کو ایک عظیم انسان سمجھتا ہوں۔ اپنی شناخت، اپنی پہچان کی خواہش ہر انسان کو ہوتی ہے لیکن وہی شخص معاشرہ میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا

جاتا ہے جو اپنی عزتِ نفس کا تحفظ کرتا ہو۔ میں نے منان منظور کو ان تمام خصوصیات کے ساتھ اپنے خانۂ دل میں بٹھایا ہے۔

رئیس اختر نے ایک ملاقات میں یہ خوش خبری سنائی تھی کہ میں نے اپنے مشترکہ دوستوں میں ایک نام کا اضافہ کیا ہے جس سے مل کر آپ کو بھی اتنی ہی خوشی محسوس ہو گی جتنی خوشی آپ کو مجھ سے مل کر ہوتی ہے۔ منان منظور اور رئیس اختر کی ملاقات کسی سرکاری کارروائی کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ رئیس اختر نے ہاؤزنگ بورڈ کے ایک فائیل کے سلسلے میں منان منظور سے ملاقات کی جو محکمہ رجسٹریشن اینڈ اسٹامپ میں مددگار رجسٹرار کی حیثیت سے کام گذار ہیں۔ جب ان دونوں کی ملاقاتیں رنگ لانے لگیں تو رئیس اختر کو یہ معلوم ہوا کہ منان منظور ایک تخلص بھی رکھتے ہیں۔ ایک دن رئیس اختر نے یہ کہتے ہوئے منان منظور سے تعارف کروایا کہ میں اپنے قبیلے میں جس شخص کا اضافہ کرنا چاہ رہا تھا یہ وہی شخصیت ہے۔ اس پہلی ملاقات کے بعد منان صاحب سے کہیں کہیں ملاقات ہوتی تھی، لیکن حُسنِ اتفاق سے جب میرے ملے پلی کے مکان کی خریدی کا مسئلہ درپیش آیا تو میں نے منان صاحب سے قدم قدم پر رہنمائی حاصل کرتے ہوئے مکمل تعاون حاصل کیا۔ مکان کی رجسٹری کے تمام مرحلے راست منان صاحب کی نگرانی میں خوش اسلوبی کے ساتھ طے پائے۔ منان صاحب کی غیر معمولی دلچسپی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس پہلے تاثر کو میں نے دل کے ایک مخصوص گوشے میں محفوظ رکھا ہے اُسی آن بان کے ساتھ۔ اس پہلے اپنے پن کے تاثر کے بعد ہماری ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب میں ۱۹۸۸ء میں ملے پلی کے مکان میں منتقل

ہوگیا تو میں نے دیکھا کہ اس محلہ میں منان منظور ہی ایک ایسی شخصیت ہے جو میرا ہم خیال ہوتی جارہی ہے۔ رفتہ رفتہ عزیز بھارتی، مومن خان شوق سے بھی (جو ملے پلی ہی میں رہتے ہیں) رسم و راہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں عزیز بھارتی صاحب سے اچھی طرح واقف تھا، اُن کی شاعرانہ صلاحیت سے بھی متاثر تھا لیکن ہماری جان پہچان، دوستی کے دائرہ میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ منان صاحب کی دلچسپی سے ہماری جان پہچان دوستی میں بدل گئی۔ میں مومن خان شوق سے بھی واقف تھا۔ اُن سے ایوانِ اُردو میں اکثر دفعہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میں نے انہیں پچھلی ملاقاتوں میں ہی ایک نفیس، سلجھا ہوا انسان پایا۔ ملے پلی کے دوستوں کی فہرست میں کچھ دنوں بعد صادق نوید کا بھی اضافہ ہوا۔ اب تو یہ حال ہے کہ ہم (صلاح الدین نیر۔ منان منظور۔ عزیز بھارتی اور مومن خان شوق) تقریباً ہر روز ملا کرتے ہیں۔ ازراہِ عنایت میرے یہ دوست اپنی اپنی سہولت سے مجھ سے ملنے آجاتے ہیں۔ ہم جب ایک ساتھ ملتے ہیں تو شعر و ادب کی محفلوں سے وابستہ شخصیتوں اور مشاعروں کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ ہماری ہر نشست ایک خوشگوار کیفیت سے گذرتی رہتی ہے۔

منان منظور کے حلقۂ احباب میں بھی بعض شاعر و ادیب اپنی خصوصیات و انفرادیت کے ساتھ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے آفس کے ساتھی اور کچھ ہم محلہ اصحاب سے بھی ان کے اچھے خاصے روابط ہیں۔ ان کی طرزِ حیات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں دوستوں کی تعداد بڑھانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ منان صاحب کے جتنے بھی دوست ہیں اور جن سے مجھے واقفیت ہے

ہیں یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ وہ ان کے حُسنِ سلوک اور ان کی ملنسار طبیعت سے بے حد متاثر ہیں۔ مجھے خود اندازہ ہے کہ شاعر دوستوں میں میرے علاوہ رئیس اختر، عزیز بھارتی، رحمٰن جامی، مومن خان شوق وغیرہ بھی ان کے گوشۂ دل میں اپنے پورے اعزاز کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

منان صاحب ایک کم گو انسان ہیں، غیر ضروری گفتگو کو طوالت دینا انہیں پسند نہیں۔ معاشرہ کے ہر مسئلہ پر کھُل کر اظہارِ خیال کرنے کی ان میں اعلیٰ صلاحیت موجود ہے۔ صائب الرائے ہونے کے علاوہ سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک ہیں۔ انہیں اس بات کا سلیقہ ہے کہ کس طرح دوستی کے معیار کو باقی رکھا جاسکتا ہے۔ میرا اپنا تجزیہ ہے کہ منان منظور، پاک طینت، خوش فکر، خوش مزاج اور شگفتہ طبیعت کے حامل انسان ہیں۔ اگر کوئی اجنبی شخص ایک دفعہ بھی اُن سے ملاقات کرے تو وہ اُن کی شخصیت کے سحر سے آزاد نہیں ہوسکتا وہ اس فکر میں رہتا ہے کہ اُن کی دوستی کا شجر سایہ دار ہر ایک موسم میں ٹھنڈی چھاؤں دیتا رہے۔ منان منظور کی شاعری میں گہرائی تو ہے ہی، گیرائی بھی ہے سیدھے سادے انداز میں وہ جن خیالات کو پیش کرتے ہیں اُن سے سامعین وقاری متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں شگفتگی اور تازگی کے ساتھ ایک گہرا تاثر ملتا ہے۔ ان کے اشعار پڑھنے اور سننے سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے سارے اشعار میں برجستگی و آمد ہے۔ وارداتِ قلبی کو عمدگی سے پیش کرتے ہیں۔ مشاہدات کی صداقت نے بھی ان کے اشعار کو پُر اثر بنا دیا ہے۔ منان منظور کا حافظہ بھی بہت تیز ہے۔ زبانی شعر سناتے ہیں۔ تحت اللفظ میں شعر سنانا

اُنہیں پسند ہے۔ میں نے کسی مشاعرہ میں بھی کاغذ ہاتھ میں لئے ہوئے اُنہیں نہیں دیکھا۔ غزل سنانے سے پہلے دو تین قطعات لازماً سناتے ہیں۔ اُن کا یہ ایک اسٹائیل ہے۔ چار مصرعوں میں اپنی بات کو ہنرمندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس طرح کہ سننے اور پڑھنے والے متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں فارسی آمیز ترکیبیں بہت کم ملیں گی۔ روزمرہ زندگی میں انسان اپنی بات کہنے کے لئے جن لفظوں کا سہارا لیتا ہے، منان منظور اُنہیں الفاظ کو سلیقے سے اپنے اشعار میں برتتے ہیں۔ منان منظور صاحب کی سنجیدہ طبیعت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، وہ غیر ضروری باتوں میں اُلجھ کر اپنے بامعنی الفاظ کو ضائع نہیں کرتے۔ جس موضوع پر انہیں گفتگو کرنی ہو، نپے تلے انداز میں اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔ ان کے طرز تکلم میں جہاں ایک مخلصانہ رویہ ان کو غیر نزاعی بناتا ہے، وہیں ان کا حسن سلوک، مقابل کو گرویدہ بنا دیتا ہے۔ موضوع گفتگو کچھ بھی ہو، منان منظور کی رائے کو اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اس لئے کہ ان کی ذہانت اور معاملہ فہمی کی صلاحیت ان کی اپنی ذاتی ملکیت ہے جس کے لئے وہ کسی اور بیرونی تاثر کو قبول کرنا پسند نہیں کرتے۔ میرا ایک تاثر یہ بھی ہے کہ منان منظور کے حلقہ احباب میں جو شخص بھی ایک دفعہ داخل ہو جاتا ہے وہ وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ منان منظور کے شائستہ روابط، احباب کے لئے تو نسیم بہار کی تازہ خوشبوؤں کی طرح مشامِ جاں کو مہکاتے رہتے ہیں میں خود بھی منان منظور کی شخصیت کے سحر سے نہ نکل سکا۔ منان منظور کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ اُن سے جب کبھی بھی ملتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے آپ سے مل رہا ہوں۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ منان منظور کا نام دوستوں کی فہرست میں کس نمبر پر رکھوں۔

--

سلسلۂ روز و شب کا ایک کامیاب شاعر

(عزیز بھارتی)

ایسے اہلِ قلم جو اپنی زندگی کے خدو خال کی ترتیب و تزئین میں مخلصانہ اور دیانت دارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، انہیں اپنی شخصیت اور اپنی فنکارانہ حیثیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں کبھی بھی مایوسی نہیں ہوتی۔ ایسے صاحبانِ فکر و نظر اپنا دامنِ مراد ہر اقسام کے خوش رنگ پھولوں سے بھر لیتے ہیں۔ معاشرہ میں سانس لینے والے ایسے دانشوروں کا ایک ایک لمحہ، حیاتِ جاوداں کی بشارت دیتا ہے اور وہ بلا قیدِ موسم فطرت شناسی کے ثبوت میں اپنے فکر و خیال کو پیراہنِ گل سے آراستہ کرتے ہوئے مشامِ دل و جاں کو معطر کرتے ہیں۔ ایسے باشعور، شائستہ مزاج اور مہذب لوگ تخلیقی عمل سے گذرتے ہوئے جب شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو آس پاس کے ماحول کو عطر بیز فضاؤں سے روشناس کرواتے ہیں۔ جو قلم کار ذہنی و فکری طور پر تربیت یافتہ ہو اور جس کے فکر و خیال میں سلسلہ روز و شب کی نرمی و گرمی ہو وہ بلا شبہ ادب میں اپنی ایک الگ پہچان بنا لیتا ہے۔ اپنی شناخت اپنی پہچان انسان کا سب سے اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اپنے وجود کا احساس انسان کو باوقار انداز میں جینے کا فن سکھاتا ہے۔ اپنی شاعرانہ انا اور اپنی خودداری کا تحفظ

اصول پسند، محبت شناس اور با کردار اہلِ قلم کا وطیرہ ہوتا ہے۔ عزیز بھارتی بھی اسی زمرہ سے تعلق رکھنے والے شاعر ہیں جنہیں قدرت نے ان تمام خوبیوں سے سرفراز کیا ہے جن کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ہمارے شہر میں خود اعتمادی کے ساتھ عملی زندگی سے گذرنے والے، اس سرزمین سے والہانہ وابستگی رکھنے والے اور یہاں کے بنتے بگڑتے معاشرہ کا اپنے آپ کو حصہ سمجھنے والے لوگ زندگی کی رعنائیوں کے ساتھ حیات کی تلخیوں اور شب و روز کی جد و جہد سے بھی اچھی طرح مانوس ہیں۔

عزیز بھارتی نے ایک شاعر اور معاشرہ میں پسند کئے جانے والے ایک انسان کی طرح اپنی زندگی کے سفر کو خوشگوار انداز میں جاری رکھا ہے۔ ان کی طبیعت ہمہ رنگ اور تنوع پسند ہے لیکن اس کے باوجود ان کے رکھ رکھاؤ ان کی نشست و برخواست کی میانہ روی، ان کی شخصیت کی آبیاری میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔ عزیز بھارتی ایک معتبر شاعر کی طرح اپنی مخصوص انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے فن کے ساتھ دیانت داری برت رہے ہیں۔ ان کا شاعرانہ لب و لہجہ بھی ان کے شائستہ اندازِ گفتگو کی طرح متاثر کرتا ہے۔ ان کی شاعری بھی مشاہدات، تجربات و محسوسات کا ایک ایسا دل پذیر تحفہ ہے جس کی خوشبو دامانِ شعر و ادب کو مہکا رہی ہے۔ معاشرہ کے اُتار چڑھاؤ اور کشمکشِ حیات نے ان کی شاعرانہ صلاحیت کو اُبھارنے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔

عزیز بھارتی تقریباً ۲۵ سال سے شعر و ادب کی محفلوں میں اپنے شاعرانہ وجود کا بھرپور احساس دلا رہے ہیں۔ دل میں نشتر کی طرح اترنے والے اُن

سے شعر قاری و سامع کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں، اچھے اور متاثر کرنے والے شعر سننے اور پڑھنے کے بعد شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔

ایسا شاعر جو اپنے ذاتی تجربات اور ماحول کی عطا کی ہوئی واردات کو اپنے شعروں میں ڈھال دیتا ہے تو اس کے شاعرانہ لب و لہجہ میں خود بخود پُراثر کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ عزیز بھارتی اپنے معاصرین میں اپنی شاعرانہ انفرادیت کی وجہ سے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایسے ہی شاعر ہمارے شہر کی آبرو سمجھے جاتے ہیں جو متوازن طرزِ زندگی سے معاشرہ میں باعزت مقام حاصل کرتے ہوئے اپنی شخصیت کی نشوونما میں مصروف ہیں اور ایسے محترم شاعر ہی اپنے دور کی ادبی تاریخ کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ عزیز بھارتی نے اپنی غیر نزاعی اور شائستہ روش سے دانشورانِ شعر و ادب کی صفوں میں اپنے لئے ایک اہم جگہ بنالی ہے۔ ان کی مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

عزیز بھارتی نے جہاں اچھی غزلیں کہی ہیں وہیں انھوں نے عمدہ نظمیں اور قطعات بھی کہے ہیں۔ اُنھوں نے ہر صنفِ سخن کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے وہ ایک کامیاب غزل گو شاعر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے قطعات بھی دل کو متاثر کرتے ہیں۔ عزیز بھارتی ہمارے شہر کی بعض کارکرد اور فعال ادبی انجمنوں سے وابستہ ہیں لیکن وہ مرکزِ ادب کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جس کے وہ خود صدر ہیں۔ مرکزِ ادب ہمارے شہر کی ایک کارکرد ادبی انجمن ہے۔ عزیز بھارتی کے دوست و احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے لیکن وہ اپنے مخصوص احباب میں

زیادہ کھلتے ہیں۔ شاعرانہ بانکپن، دلنشیں انداز گفتگو اور متاثر کن لب و لہجہ کی وجہ سے وہ اپنے احباب میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ عزیز بھارتی با اعتماد دوستوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک طویل عرصے سے درس و تدریس کے مقدس پیشہ سے وابستہ ہیں اور اپنی تدریسی ذمہ داری کو دیانت داری کے ساتھ پورا کر رہے ہیں۔ اپنے شاعر دوستوں کی طرح اپنے ہم پیشہ اساتذہ سے بھی ان کے روابط استوار ہیں۔

میری دلی خواہش ہے کہ عزیز بھارتی اپنی موجودہ شناخت کے ساتھ اپنا شعری سفر جاری رکھیں۔ یقین ہے کہ اس مجموعۂ کلام کو بھی ادبی حلقوں میں بھی اچھی خاصی پذیرائی ہوگی۔ "چشم معتبر" میں مجھے جو اشعار زیادہ پسند آئے ان میں سے چند نذر قارئین ہیں ؎

رہِ حیات میں جب تیرا ساتھ ہوتا ہے
وہ ایک لمحہ مکمل حیات ہوتا ہے

زمانہ ہاتھ ملاتا ہے اس گھڑی ہم سے
ہمارے ہاتھ میں جب تیرا ہاتھ ہوتا ہے

آئیے کچھ اپنی بھولوں کا بھی اندازہ کریں
داغ تو چہرے پہ ہیں کیوں آئینہ پونچھا کریں

بدظنی سے اور بڑھتے ہیں دلوں کے فاصلے
آئیے ہم وقت سے اب کوئی سمجھوتہ کریں

نہیں یہ فکر کہ ظلمت نے پر نکالے ہیں
ہمارے ساتھ بھی احساس کے اجالے ہیں

بدل بدل کے ملو بھیس چاہے کتنے ہی
رہے خیال کہ ہم بھی نگاہ والے ہیں

وقت نے رکھا تھا میرے آگے ایسا ہی سوال
ہاں ہی کہنا تھا مناسب دوسرا رستہ نہ تھا

یہ کیسا کہ نیند آگئی ہم کو دم سحر
اس صبح کے لئے ہی تو جاگے تھے رات بھر

کچھ اس طرح سے وہ مرے ہمراہ چل پڑا
دنیا سمجھ رہی ہے اسے میرا ہم سفر

-٠- -٠- -٠- (پیش لفظ - چشم معتبر ۱۹۹۱ء)

مادرِ جامعہ کا ایک خوش نصیب فرزند

ڈاکٹر سی نارائن ریڈی ستار

کسی بھی شخص کے بارے میں یہ قیاس آرائی ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے سفر میں کن کن مرحلوں سے گذرتے ہوئے شہرت کی آخری حدوں تک پہونچ سکتا ہے۔ لیکن بعض شخصیتوں سے ملنے کے بعد اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ ایسے غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے لوگ ایک نہ ایک دن شہرت و عظمت کی آخری منزل پر جا پہونچ جائیں گے۔ جب ایسی شخصیتوں سے مل کر یہ احساس ہو کہ یہ شخصیتیں اپنے ہی جیسی [illegible] ہیں تو ساری ذہنی تھکن دور ہو جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ دل و دماغ [illegible] فضاؤں میں سیر کر رہے ہیں۔

انسان کو اپنی زندگی میں کچھ ایسے انسانی [illegible] سے بھی سابقہ پڑتا ہے جن کی وابستگی سے فہم و فراست کے بیشتر گوشے [illegible] خیالوں کا سفر طے کرتے ہوئے پُر نور فضاؤں میں پھیل جاتے ہیں۔ زندگی کے سفر میں کچھ ایسی شخصیتوں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جن سے مل کر فکر و خیال، شعور و وجدان کی شمعیں جگمگانے لگتی ہیں اور جن کی محبت، عنایت، مروت، روشن خیالی اور شائستہ مزاجی کی وجہ سے معاشرہ کے خد و خال میں رنگ و نور کی بارش ہونے لگتی ہے۔ معاشرے کی ایسی

نمائندہ شخصیتیں، رشتوں کی مہک کا احساس دلاتے ہوئے خوشبو کا سفر طے کرتی ہیں تو کتنے ہی لوگ اُن کے فضاؤں میں اپنی زندگی کی صبح و شام کو سموتے ہوں گے۔

جب ایسے کامیاب و بامراد لوگ سر اُٹھا کر کامرانی کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر طے کرتے ہیں تو بے شمار افراد ان کے کاروانِ خود شناسی میں شریک ہوتے ہوئے ایک ایسی منزل کی طرف بڑھتے ہیں جس کی کوئی حد آخر نہیں ہوتی۔ ایسے ہی باکمال اور خوش نصیبوں میں گیان پیتھ ایوارڈ یافتہ ممتاز شاعر پروفیسر سی نارائن ریڈی کا اسمِ گرامی ہے کا نام بھی سرِ فہرست دکھائی دیتا ہے۔

اپنے گھر کے خاص تہذیبی ماحول سے آراستہ پیراستہ ہونے کے بعد جب ڈاکٹر ریڈی نے کریم نگر سے حیدرآباد کا رُخ کیا تو یہاں اُنہیں مختلف النوع مزاج لوگوں سے سابقہ پڑا۔ وہ سب کے ساتھ رہتے لیکن اپنے ضمیر کی آواز کو سنتے ہوئے اپنے انداز سے روز و شب گزارتے ہیں۔

مادرِ جامعہ عثمانیہ اپنے جن لائق فرزندوں پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی اور جب مورخ جامعہ عثمانیہ کے عالمی شہرت یافتہ سپوتوں کی فہرست بنائیگا تو ڈاکٹر ریڈی کا نام اِس فہرست میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔

جامعہ عثمانیہ کے ماحول نے ملی اکٹر ریڈی کو تہذیب و تمدن، بھائی چارگی اور رواداری، نشست و برخواست کا سلیقہ اور آدابِ گفتگو کا درس دیا ہے۔ فاضل اساتذہ کی ذہنی تربیت نے انہیں زندگی کے طویل سفر کو کامرانی و کامیابی کے ساتھ طے کرنے کا گُر سکھایا ہے۔ اچھا ماحول، اچھے ساتھیوں اور اچھے دوستوں کی خوشبو اِن کے فکر و خیال کو مہکاتی رہی ہے۔

ہم عثمانین کے لئے یہ خود بھی ایک بڑا اعزاز ہے کہ ہم میں سے ایک شخص حیدرآباد کی تہذیب، روایات اور یہاں کی عطر بیز ماحول میں سانس لیتا ہوا اپنے ارتقائی سفر کو جاری رکھتے ہوئے وائس چانسلر کے اعلیٰ عہدہ پر پہونچ چکا ہے۔

میں اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں تلگو کے جن نامور شاعروں کی شاعرانہ صلاحیتوں اُن کی شہرت و عظمت اور ادبی حلقوں میں ان کے فکر و فن کی مقبولیت اور پذیرائی سے واقف تھا اُن میں ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی کا نام بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر ریڈی سے پہلی ملاقات سے قبل میں اُن کی تلگو فلمی شاعری سے بھی واقف تھا۔ تلگو کے اس شاعر سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا جس کی شاعری میں اُردو کے الفاظ بھی ملتے ہیں اور جو حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب و روایت کو اپنی کویتاؤں اور اپنے فلمی نغمات میں سموتا رہتا ہے۔ جس زمانے میں ڈاکٹر ریڈی شعبۂ تلگو جامعہ عثمانیہ سے وابستہ تھے اُس زمانے سے ہی وہ تلگو فلموں کے لئے لکھ رہے تھے اور ان کے نغموں کی شہرت پھیلتی جارہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات ایک یادگار اور عظیم الشان جلسۂ عام میں اُس وقت ہوئی جب ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی صدر جمہوریۂ ہند بننے کے بعد پہلی دفعہ حیدرآباد آئے تھے اور جن کا شہریانِ حیدرآباد و سکندرآباد کی جانب سے پبلک گارڈن (لال باغ) میں شاندار پیمانے پر استقبال کیا گیا تھا۔ اِس تقریب میں ڈاکٹر ریڈی کو تہنیتی نظم سنانے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ اُردو شاعروں میں یہ اعزاز مجھے حاصل ہوا تھا۔ اِس پہلے تعارف کے بعد ڈاکٹر صاحب سے سرکاری

و غیر سرکاری مختلف تقاریب میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے تقریباً ۲۵ سالہ دوستانہ مراسم ہیں، لیکن گذشتہ ۱۰، ۱۲ سال سے ہم ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب آ گئے ہیں۔ اردو شعر و ادب سے متعلق جب کوئی بات دریافت طلب ہو یا کسی موضوع پر مشورہ مقصود ہو یا مشورۂ سخن درکار ہو تو وہ مجھے فون کرتے ہیں یا موٹر بھیج کر تلگو یونیورسٹی یا اپنے گھر بلاتے ہیں۔ یہ سلسلہ استواری کے ساتھ اب بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ نئے شاعروں اور نئے دوستوں سے بھی تحفظ ذہنی ملا کرتے ہیں۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جب وہ اپنے دوستوں کو نوازنا چاہتے ہیں تو مناسب موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ تلگو یونیورسٹی میں جب ایم۔ اے اُردو کے کورس کی تیاری کے سلسلے میں بورڈ آف اسٹڈیز کی تشکیل عمل میں لائی گئی تو اس میں میرا نام بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فون پر مجھے اس بات کی اطلاع دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے آپ کا نام خصوصیت کے ساتھ شامل کیا ہے۔ جب میں نے یہ کہا کہ میں نہ تو کسی کالج کا لکچرر ہوں، نہ کسی یونیورسٹی کا ڈاکٹر یا پروفیسر تو پھر آپ نے مجھے کیوں بورڈ آف گورنرس میں شامل فرمایا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ جب ایک شاعر کی شخصیت اور اس کے فن پر یونیورسٹیز میں ریسرچ ہو سکتا ہے تو کیوں نہ اُن کی صلاحیتوں سے تعلیمی اُمور میں بھی استفادہ حاصل کیا جائے میں نے آپ کے نام کو شامل کر کے ایک خوشگوار روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت لسانی مسائل پر ہمیشہ غیر نزاعی رہی وہ سلجھے ہوئے دانشوروں کی طرح لسانی مسائل پر اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں کہ سُننے والا یہ

سمجھتا ہے کہ وہ ان کی اپنی زبان کے ترجمان و نمائندے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ملک کی تمام زبانوں کا احترام کرتے ہیں۔ اردو زبان کی عظمت اس کے رچاؤ اور اس کی دل کو چھونے والی کیفیات کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ ان کا یہ لسانی نظریہ ہے کہ ملک کی ہر زبان کو اس کا دستوری حق ملنا چاہیئے، جس طرح ہر شہری کو دستور کی روشنی میں سانس لینے کا حق حاصل ہے۔

ڈاکٹر صاحب جس زمانے میں آفیشیل لینگویج کمیشن کے صدر نشین تھے تو ان دنوں تلنگانہ ملازمین خاص طور پر مسلمان ملازمین تلگو نہ جاننے کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے اپنی خدمت کا جائزہ لیا تو انہوں نے آفیشیل لینگویج کی پالیسی کو متوازن بنا دیا۔ وہ بات نہیں رہی جو ان سے پہلے کے چیرمین کے زمانے میں تھی۔

سکریٹریٹ میں ڈاکٹر صاحب کا اجلاس اور میرا سکشن ایک ہی بلڈنگ میں واقع تھا۔ اکثر ان سے ملاقات ہوتی تھی، کبھی تو لفٹ کے پاس اور کبھی ان کے موٹر میں سوار ہوتے وقت اور کبھی موٹر سے اترتے وقت اور کبھی ان کے اجلاس پر۔ جب کبھی ملازمین کے تلگو میں نوٹنگ اور مراسلت کا مسئلہ درپیش ہوتا تو میں ان سے آفس میں ملتا اور اس مسئلہ پر گفتگو رہتی۔ میں یہ کہتا کہ تلنگانہ کے ایسے ملازمین سرکاری دفاتر میں بہت کم رہ گئے ہیں جو تلگو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں اور جو حکومت کی حالیہ پالیسی و احکامات سے سخت پریشان ہیں، آپ تلگو نوٹنگ اور مراسلت کے سلسلے میں نرم پالیسی اختیار کریں (جیسا کہ آپ کی طبیعت کا خاصا ہے)، تو مناسب ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ میں جب بھی کلکٹرس کی میٹنگ بلاتا ہوں یا اضلاع کے دورہ

جاتا ہوں تو متعلقہ محکموں کے سربراہوں سے یہی کہتا ہوں کہ جنھیں تلگو آتی ہے
وہ تلگو میں مراسلت کریں اور جنھیں تلگو نہیں آتی انہیں مجبور نہ کیا جائے بلکہ انہیں
لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی جائے اور ایسے ملازمین جن کی عمر 45 سال سے
تجاوز کر گئی ہے اور وہ جو وظیفہ کے قریب ہیں انہیں مستثنیٰ رکھا جائے۔ ڈاکٹر
ریڈی کی چیرمن شپ کا دور ملازمین سرکار کے لئے نہایت سکون و اطمینان کا رہا۔
ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں سے ہی نہیں عام لوگوں سے بھی خندہ پیشانی
سے پیش آتے ہیں۔ ان کے اندازِ تخاطب میں نرمی ہے، لہجہ میں مٹھاس ہے۔
پرکشش شخصیت میں ایک بانکپن ہے۔ شگفتگی اور شائستگی ان کے لب و لہجہ کی
پہچان ہے۔ ڈاکٹر صاحب بہترین دوست، بہترین دانشور اور بہترین شاعروں میں شمار
کئے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسانی رشتوں کے ترجمان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب
نہایت سادگی اور خوش اخلاقی کے ساتھ معاشرہ کے ہر اس شخص سے بھی ربط رکھنا
چاہتے ہیں جو روشنی کی تلاش میں اندھیروں کی رہ گذر سے بھی گذرتا رہتا ہے۔
جب ایک دفعہ وہ کسی سے ملتے ہیں تو برسوں گذرنے کے بعد اگر اس سے کہیں ملاقات
ہو تو اس کو پہچان لیتے ہیں۔ شناخت اور پہچان کے معاملے میں ان کی حسیات
بہت تیز ہیں۔ اپنی شرافت، دوستانہ اور مخلصانہ رویہ کی وجہ سے حیدرآباد کی
ہر نمائندہ سوسائٹی میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ اپنے حیدرآبادی
دوستوں سے اُردو میں بات کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں شگفتگی و شائستگی کے ساتھ اپنا پن
بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فطرتاً جہاں سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں وہیں قدرت
نے انہیں ظرافت کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔ دورانِ گفتگو ظریفانہ جملوں سے محظوظ

کو لالہ زار بناتے رہتے ہیں۔ انہیں قدرت نے خوش مزاجی، خوش پوشی اور خوش نگاہی اور خوش اخلاقی کو فراخ دلی کے ساتھ عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک سیکولر ذہنیت اور روشن خیالات رکھنے والے انسان کی حیثیت سے بھی معاشرے میں اپنا ایک منفرد مقام بنا چکے ہیں۔ ان کے ہاں کسی قسم کا بھید بھاؤ نہیں ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ کون کس مذہب کس عقیدہ اور کس زبان سے تعلق رکھتا ہے، وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں، ان کے دوستوں اور ان کے چاہنے والوں کی فہرست میں ہر وہ شخص شامل ہے جو زندگی کی مثبت قدروں کی پاسداری کرتا ہو۔ ڈاکٹر صاحب جیسے اعلیٰ ظرف، وضع دار لوگ بہت کم ملتے ہیں جو بلند مرتبہ کے حامل ہونے کے باوجود انسانی کمزور رشتوں سے جڑے ہوئے لوگوں سے بھی اپنا رشتہ رکھتے ہیں۔ وہ معاشرے میں بکھرے ہوئے تمام انسانی رشتوں کو سمجھنا جانتے ہیں۔ اپنوں اور غیروں کی خوشیوں اور مسرتوں اور ان کے دکھ درد میں بھی برابر کے شریک رہتے ہیں۔

تلگو شاعری میں صنف غزل کو پروان چڑھاتے ہیں ڈاکٹر صاحب کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ اردو غزل کے تمام شعری لوازمات، مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف، تخلص اور شعر کے دونوں مصرعوں کا آپس میں ربط کا خاص طور پر کامیابی کے ساتھ لحاظ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نام سی۔ نارائن ریڈی کی مناسبت سے ستارے تخلص اختیار کیا ہے۔ ان کی تلگو غزلوں کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ منظر عام پر آ چکے ہیں اور جو کافی مقبول ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب عنقریب منتخب تلگو شاعری کا اردو منظوم ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے

اپنے کلام کا انتخاب، شروع کیا ہے۔ توقع ہے کہ جلد ہی وہ اس خوشگوار فریضہ سے بھی عہدہ برآ ہوں گے۔ اردو والے ڈاکٹر صاحب کو اپنی زبان کا شاعر سمجھتے ہیں اس لئے بھی حق بجانب ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیشتر تلگو نظموں کا کامیاب اردو منظوم ترجمہ کیا ہے اور ان کی بہت سی نظمیں روزنامہ سیاست میں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اردو مشاعروں میں تلگو شاعری سنا کر بھی داد حاصل کرتے ہیں۔ عوام اور دانشورانِ فکر وفن ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر بھی فخر محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ذریعہ اردو تعلیم گرائجویشن کیا ہے۔ شستہ اردو میں نہ صرف مخاطب کرتے ہیں بلکہ ریڈیو، دوردرشن کے علاوہ ادبی جلسوں، سمینار سے مخاطب کرتے ہوئے اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے گذشتہ (۳۰) برسوں میں تلگو فلموں کے لئے سیکڑوں گیت اور نغمے لکھے ہیں۔ وہ ایک کامیاب فلمی شاعر کی حیثیت سے بھی کافی شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے فلمی شاعری میں قدرتی مناظر، پیار، محبت کے علاوہ انسانی اقدار اور انسانی رشتوں کو اہمیت دی ہے۔ اپنی فلمی شاعری میں انہوں نے ادب کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا، سماج کی نابرابری، حق تلفی، بگڑتے ہوئے سماج کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجالوں اور اندھیروں کے درمیانی فرق کے احساس کو جگایا ہے۔ زندگی سے پیار کرنا اور اونچ نیچ کی دیواروں کو ڈھادینا، انسانی رشتوں کی پذیرائی کرنا ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر ہیں لیکن ان کے پاس عصری حسیت بھی بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ اردو کے شاعروں میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، مخدوم محی الدین اور ساحر لدھیانوی ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ گو کہ وہ کلاسیکی ادب کو سنگِ میل اور بنیاد کا پتھر سمجھتے ہیں، لیکن ترقی پسند نقطۂ نظر کو وہ زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ انہیں معاشرہ میں ہر وہ انسان عزیز ہے جو اُجالوں کی سرزمین پر مایوس اور غم زدہ لوگوں کو دیکھ کر اپنا امن بھلو لیتا ہے۔

==

۱۹۹۱ء

سیاست

ایم۔ اے۔ رؤف ___ ایک پُرکشش شخصیت

بعض شخصیتیں اس قدر پُرکشش اور متاثر کن ہوتی ہیں کہ وہ پہلی ملاقات ہی میں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہوئی اپنی شائستہ مزاجی کا پتہ دیتی ہیں۔ اُن کے مزاج کی سادگی، ملاقاتیوں پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے اور وہ اپنے طرزِ تخاطب، اندازِ گفتگو رکھ رکھاؤ اور حُسنِ سلوک سے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ اُردو کے ممتاز ادیب و نقاد پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے رؤف صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:۔

"آپ نے حیدرآباد کے قیام میں وہ دلداری و دلنوازی فرمائی کہ میں غمِ بے کسی کو بھول گیا اور پورا سفر دہلی ایک بڑے شاہانہ طریقہ سے گذرا۔ ہر اسٹیشن پر سلام و نیاز اور آداب۔ ہر کار اور کوئی خدمت۔ میرا واقعی ابوالحسن کا سا حال تھا۔ آپ سے ملاقات ہوئی لیکن ایسا معلوم ہوا کہ میری روح آپ کی قدیم شناسا ہے۔ اور مجھے آپ کے حضور میں حق دیرینہ حاصل ہے۔ کبھی کبھی دل کا سودا ایک نیم نگاہِ محبت سے بھی ہو جاتا ہے کہ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو کہتا کہ میں اپنی پہلی آفرینش میں حیدرآباد کے کسی کونے میں پیدا ہوا تھا۔ بعد میں مجھے بطورِ سزا شمالی ہندوستان

بھیج دیا گیا۔ حیدرآباد میں سردی زیادہ نہ کم، گرمی بھی اس بلا کی نہیں کہ نگاہ، غسل خانہ سے نکلنے کا نام ہی نہ لے۔ یہاں کی آب وہوا بھی مہذب" لوگ بھی شائستہ اور بامحبت۔"

"پڑھے فارسی بیچے تیل" یہ بات سب پر صادق نہیں آتی۔ بہت سی نامور علمی وادبی شخصیتوں نے نہ صرف فارسی پڑھ کر اپنے علمی و ادبی مرتبے کو اونچا کیا ہے بلکہ وہ فارسی پڑھ کر اعلیٰ ترین خدمات پر بھی فائز رہی ہیں۔ رؤف صاحب نے ایک ملاقات میں کہا کہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے فارسی اور عربی لے کر آئی اے ایس کا امتحان کامیاب کیا ہے۔ رؤف صاحب جب بھی اپنے دوستوں سے ملتے ہیں تو اُن کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی ہے۔ اُن کے چہرہ پر تازگی اور ہونٹوں پر شگفتگی لہراتی ہے۔ وہ اپنے تمام ملنے والوں کا خندہ پیشانی سے خیرمقدم کرتے ہیں۔

پتہ نہیں پیار، محبت، خلوص اور رواداری سے معمور اس شہر محبت میں ایسی کون سی کشش ہے کہ باہر سے آنے والے یہیں کے ہوکے رہ جاتے ہیں۔ رؤف صاحب اگرچہ کہ حیدرآبادی نہیں ہیں لیکن اُن کی شخصیت میں حیدرآبادیوں جیسی بھرپور محبت، ملنساری، رواداری ملتی ہے اور اُن کا یہ خلوص رویہ ایک خاص قسم کی تازگی کا احساس دلاتا ہے۔ رؤف صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے صرف خوشی ہی نہیں ہوتی بلکہ ساری ذہنی تھکن دور ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ملنے والوں سے بلا تکلف دوستانہ فضا میں گفتگو کرتے ہیں۔ شعر و ادب پر تبصرہ ہوتا ہے، مشاعروں اور شاعروں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اُنہیں اُردو اور فارسی کے بہت سے اچھے شعر یاد ہیں۔ اُن کا حافظہ اتنا تیز ہے کہ دورانِ گفتگو مناسب موقع پر برجستہ موزوں شعر سنا کر

اپنی گفتگو کو اور زیادہ موثر بنا دیتے ہیں۔ حیدرآباد کے ہر بڑے مشاعرہ میں اُن کی شرکت لازمی سمجھی جاتی ہے۔ ہر اچھے شعر پر کھل کر داد دیتے ہیں اور مناسب انداز سے مصرعوں کو دہراتے ہوئے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رؤف صاحب کو اُردو شاعری سے کافی دلچسپی ہے۔ اُن کی پرائیویٹ لائبریری میں محمد قلی قطب شاہ کے دیوان سے لے کر عصرِ حاضر کے تقریباً تمام اہم شاعروں کے شعری مجموعے موجود ہیں فارسی اور اُردو کے اساتذہ سخن میں حافظ شیرازی، شیخ سعدی، مرزا غالب اور علامہ اقبال کے دلدادہ ہیں۔ رؤف صاحب کے شخصی مراسم یوں تو ملک کے تقریباً تمام اہم شاعروں اور ادیبوں سے ہیں لیکن خمار بارہ بنکوی سے اُن کی دوستی مثالی ہے خمار صاحب جب بھی حیدرآباد آتے ہیں تو اُن کا زیادہ وقت رؤف صاحب کے ساتھ گذرتا ہے۔ شاذ تمکنت مرحوم سے بھی اُن کے اچھے مراسم تھے، حیدرآباد کے شاعروں میں راشد آذر اور صلاح الدین نیر اُن کے بہترین دوستوں میں سے ہیں۔ حیدرآباد میں رؤف صاحب کے دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ محتاط رویہ کے باوجود بھی کچھ ایسے دوست ہیں جن سے وہ کھل کر ملتے ہیں اور کچھ ایسی شخصیتوں سے بھی اُن کی رسم و راہ ہے جن کا وہ بے حد احترام کرتے ہیں۔ جناب عابد علی خان اور جناب محبوب حسین جگر کی شخصیت سے وہ بے حد متاثر ہیں۔ اگرچہ اُن سے ملاقاتیں بہت کم ہوتی ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ حضرات اخبار سیاست کے ذریعہ حیدرآباد کی علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی خدمات کے ساتھ ساتھ حیدرآباد کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اخبارِ سیاست میرا پسندیدہ اخبار ہے، اس میں دنیا بھر کی اہم منتخب خبروں کے علاوہ ملک، اپنی ریاست اور اپنے شہر کی تمام اہم خبریں

پڑھنے کو ملتی ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں اور تشنگانِ شعر و ادب کے لئے اتوار ادارہ ایڈیشن کا ادبی ایڈیشن تسکین ذوقِ سلیم کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اخبار سیاست قومی یکجہتی لسانی ہم آہنگی، ملی جلی تہذیب اور یہاں کے رسم و رواج کی عکاسی میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ جناب عابد علی خاں کی شخصی دلچسپی ہی کی وجہ سے شہر میں ہر سال دو کل ہند مشاعرے ہوتے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ، شنکر جی مشاعروں کی شہرت سارے ملک میں بلکہ بیرونِ ملک بھی پہونچ چکی ہے جس کا ثبوت اُن تحریروں سے ملتا ہے جو وقتاً فوقتاً سیاست کے کالموں میں دکھائی دیتی ہیں۔

محمد عبد الرؤف ۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء کو جبل پور کے ایک مذہبی، علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کی سرپرستی اور ذہنی تربیت میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم اور مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم کی شخصی دلچسپی کو کافی دخل رہا۔ ابتدائی تعلیم جبلپور میں ہوئی۔ انہیں ابتداء ہی سے علمی و ادبی ماحول ملا۔ اسکول کے زمانے میں وہ بیت بازی کے مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی اُردو شعر و ادب سے دلچسپی رہی۔ وہ جوشؔ، فراقؔ، بیدم، شاہدی اور جمیل مظہری سے بہت متاثر ہیں۔ مشہور ڈرامہ نگار حبیب تنویر کے بھی وہ مداح ہیں۔ رؤف صاحب نے میٹرک کا امتحان مشن ہائی اسکول سیونی (مدھیہ پردیش) گریجویشن گورنمنٹ کالج ناگپور سے اور ایم۔ اے (تاریخ) کلکتہ یونیورسٹی سے کیا۔ جب وہ ایم اے کے طالب علم تھے تو اُسی زمانے میں انہوں نے (۱۹۵۸ء) میں آئی اے ایس کا امتحان پاس کیا۔ رؤف صاحب ۱۹۵۸ء میں محکمہ ریلوے میں اسسٹنٹ ٹرافک

سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے مامور ہوئے۔ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہوئے مختلف شعبوں میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ساؤتھ سنٹرل ریلوے سے وابستہ ہونے کے بعد مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ سینئر کمرشیل سپرنٹنڈنٹ پبلک ریلیشن آفیسر، چیف کمرشیل سپرنٹنڈنٹ کے عہدوں پر خدمت انجام دینے کے بعد چیف کمرشیل سپرنٹنڈنٹ کے اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز ہیں۔ رؤف صاحب ایک ایسے محکمہ سے وابستہ ہیں جس سے خاص طور پر شاعروں اور ادیبوں کو سابقہ پڑتا ہے گذشتہ کئی برسوں سے شاعروں، ادیبوں کے ریزرویشن ٹکٹس کے سلسلے میں وہ اپنی دلچسپی، تعاون اور خلوص کا عملی ثبوت دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر اس شخص کی مدد کرتے ہیں جو ان کے اجلاس پر پہنچ کر ریزرویشن کی درخواست کرتا ہے۔ طلباء کی مدد کرنے میں بھی وہ پیش پیش رہتے ہیں۔ انہوں نے دورانِ گفتگو یہ بھی کہا کہ اگلے سال مجھے وظیفہ ہو رہا ہے، سوچتا ہوں جس انداز سے میں آج شاعروں ادیبوں کی خدمت انجام دے رہا ہوں، کل میرے بعد کیا ہوگا۔ رؤف صاحب پچھلے (۴۰) سال سے سکندرآباد میں مقیم ہیں۔ یہاں کی علمی و ادبی و تہذیبی انجمنوں کی وہ سرپرستی کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے گذشتہ سال اپنی نگرانی میں ایک کل ہند مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا تھا۔ رؤف صاحب نے کہا کہ میں وظیفہ کے بعد حیدرآباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کروں گا۔ ان کی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار ہے۔ انہیں ایک لڑکا ہے جو اس سال آئی۔اے۔ایس کا امتحان دے رہا ہے۔ وہ اپنی [illegible] بہت زیادہ خدمت گذار رہا۔

○

سیاست (۱۹۹۰ء)

امریکہ میں اُردو کی خدمات

ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی سے گفتگو

اپنی شناخت، شخصیت کے تعین اور حیدر آباد کی نئی نسل کے بہترین مستقبل کے خدو خال میں رنگ بھرنے کے لئے حیدر آباد کے بہت سے تعلیم یافتہ، اعلیٰ دماغ، باصلاحیت، صحت مند فکر و خیال رکھنے والے نوجوان ترک وطن کرکے مغربی و عرب ممالک میں مقیم ہیں اور اپنے اپنے شعبوں میں سرگرم عمل ہیں۔ نئے ماحول اور نئی دنیا میں برسوں گذارنے کے بعد جب ایسے لوگ کچھ دنوں کے لئے وطن عزیز حیدر آباد آتے ہیں تو یہاں کی گلیوں، کوچوں، شاہراہوں، بازاروں، عمارتوں اور یہاں کے رہنے والوں کو دیکھتے ہوئے اپنے ماضی کی ان یادوں میں کھو جاتے ہیں جو ان کی زندگی کا ایک عظیم سرمایہ رہ چکی ہیں۔ اسی سلسلے کے ایک دانشور ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی ہیں جو شکاگو میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں، جو عید رمضان کے کچھ دن بعد امریکہ واپس ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی شکاگو کی کئی علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں، نہایت خوش مزاج، سلیقہ شعار، شائستہ و مہذب شخصیت کے مالک ہیں فاروقی صاحب نے سیاست کیلئے ایک انٹرویو میں مختلف سوالات کا جواب دیتے ہوئے

تھا کہ وہ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۷ء کو امریکہ پہونچے۔ اکران یونیورسٹی AKRON، اوہائیو OHIO نے انہیں پوسٹ ڈاکٹرل فیلوشپ دی تھی۔ ریسرچ کی ایک سال کی مدت ختم ہوتے ہی انہیں ہاسپٹل میں ملازمت مل گئی۔ ملازمت ملنے کے بعد انہوں نے بیوی بچوں کو امریکہ بلوالیا۔ اسی زمانہ میں کیلی فورنیا کی معاشی حالت خراب تھی اس لیے وہ شکاگو آگئے۔ جناب فاروقی نے بتایا کہ ۹ نومبر ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد سے کوئی 75 یا 80 میل دور ایک گاؤں بیلال میں نانی کے گھر ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کے نانا ظہیر ضلع میدک کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو سالار جنگ کی جاگیر میں تحصیلدار تھے۔ دادا محبوب پٹیل کھم پلی (ایک چھوٹا سا گاؤں جو سداسیوپیٹ اور ظہیرآباد کے درمیان واقع ہے) کے پٹیل تھے۔ پولیس ایکشن کے وقت دوسرے تباہ حال لوگوں کی طرح سارا خاندان بے خانماں ہوکر حیدرآباد پہونچا۔ ان کے والد محترم محمد مہتاب نے مختلف قسم کے کاروبار میں قسمت آزمائی کی لیکن سرمایہ کی کمی اور وسائل کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے معاشی مشکلات سے دوچار رہے فاروقی صاحب اپنے گھر کے بڑے بیٹے تھے والد کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کے والد گاؤں واپس ہوگئے۔ فاروقی صاحب حیدرآباد میں اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر رہ گئے۔ ہائی اسکول سے ایم ایس سی کرنے تک پرائیوٹ ٹیوشنس کے ذریعہ اپنی اور اپنے بھائی کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اسکول اور کالج میں اسٹوڈنٹس یونین اور بزم اُردو کی مصروفیات بھی جاری رہیں۔ سٹی کالج سے اُردو میگزین اور بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سائنس میگزین کی ادارت کی۔ انٹر کالج تقریری و تحریری مقابلے اُردو فیسٹول پروگرام اور ڈرامے اسٹیج کروانا یہ سارے کام

ایک ساتھ چلتے رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں کوئی 4 یا 5 افسانے چھپ چکے تھے۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد سائنسی مضامین لکھتے رہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے سائنس کے موضوعات پر مضامین نشر کرتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں سٹی کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ ۱۹۵۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایس سی اور ۱۹۶۱ء میں ایم ایس سی کی تکمیل کی۔ ۱۹۶۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ حیدرآباد میں آر آر ایل (ریجنل ریسرچ لیبارٹری) میں ملازم ہوگئے۔ اسی سال شادی ہوگئی۔

ڈاکٹر فاروقی نے امریکہ میں اردو زبان و ادب کی سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو جاری رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ امریکہ میں برصغیر کے کلچر کو سمجھنے کے لیے اردو جاننا ضروری ہے۔ اگر ہماری آئندہ نسلوں کو برصغیر سے ربط باقی رکھنا ہے تو انہیں اردو سیکھنا لازمی ہوگا۔ امریکہ میں بعض یونیورسٹیوں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔ امریکہ میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے ریاستی سطح پر ... مشکل ہے۔ یہاں تو صرف چند بڑے شہروں کی بات کی جاسکتی ہے۔ جیسے نیویارک، شکاگو، واشنگٹن، لاس اینجلز، ڈالس، ہیوسٹن، اٹلانٹا، میامی، ڈیٹرائیٹ، ... اور کیلی فورنیا۔

نیویارک میں اس وقت 4 یا 5 صاحب دیوان شاعر موجود ہیں جیسے مظفر شکوہ حنیف اختر، حمیرا رحمٰن اور عزیز الحسن، صبیحہ خاتون کا کلام زیر طبع ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی معتبر نام ہیں۔ اردو پروگرام منعقد کرنے والے وہاں اور کئی ہیں۔ ان میں حلقۂ فن و ادب بہت نمایاں ہے۔ شکاگو کے شعراء میں دو نام زیادہ شہرت

رکھتے ہیں، خواجہ ریاض الدین اور افتخار تبسم، دونوں صاحب دیوان شاعر ہیں۔
یہاں ایک بزرگ شاعر بھی ہیں مولانا عبدالرحمٰن سعید صدیقی، جو علامہ اقبال کے رنگ میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور صاحب دیوان شاعر ایک عزت حسین اور دوسرے خالد انور ہیں ڈاکٹر عبداللہ غازی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد کا اردو افسانے اور ناول میں بہت اچھا نام ہے۔

واشنگٹن میں علی گڑھ ایسوسی ایشن گزشتہ ۱۶ سال سے عالمی مشاعرے کروا رہی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں شکاگو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی اسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ جس کی صدارت کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔ اسوسی ایشن کی جانب سے عالمی مشاعرہ ۱۹۹۱ء کا شاندار سالانہ اہتمام کیا گیا ہے۔

لاس اینجلز میں اردو مرکز انٹرنیشنل بہت ہی سرگرم عمل ہے اور کئی برسوں سے مشاعرہ کروا رہی ہے۔ ڈالس اور ہیوسٹن ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ دونوں [illegible]ت پر مشاعرے ہر سال ہوتے ہیں۔ اٹلانٹا میں ہر سال عالمی مشاعرہ ہوتا ہے۔ [illegible]ن اور کیلیفورنیا میں بھی ہر سال عالمی مشاعرہ ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ امریکہ آنے کے بعد انگریزی میں زیادہ مضامین لکھتے رہے ہیں جو تعلیم اور تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیمسٹری میں 12 ریسرچ پیپر چھپ چکے ہیں اور شعر و ادب سے بھی بے حد دلچسپی ہے، دو افسانے ایک شعلہ، حریر کراچی میں اور دوسرا افسانہ "ناموس کا اعتماد" طلوع افکار، کراچی میں شائع ہو چکے ہیں۔ شکاگو میں حیدرآبادی بہت زیادہ تعداد میں مقیم ہیں۔ ہر حیدرآبادی اپنے بہتر سے بہتر مستقبل کی آبیاری میں معروف ہے۔

(سیاست، ۲۲ مارچ ۱۹۹۳ء)

-ج-ا-ج-

"گُل، گُلشن، گلفام" ٹی وی سیریئل کے حاجی صاحب

(پریکشت ساہنی)

ایک ایسا شخص جو اُردو تہذیب کا پروردہ ہو، پنجابی، کشمیری، اُردو، ہندی زبان کا دلدادہ اور اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کا احترام کرتا ہو اور جس کے اندازِ تکلّم، رکھ رکھاؤ اور آدابِ نشست و برخواست میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا عکس ملتا ہو اور جس میں سرزمین پشاور (راولپنڈی) کا بانکپن کشمیر جنت نشاں کی نرم روی ملتی ہو اُس سے گفتگو کا موقع اُس وقت ملا جب وہ علی سردار جعفری کے تحریر کردہ ٹی۔ وی سیریئل کہکشاں کے ایک حصہ جوشؔ ملیح آبادی کی شوٹنگ کے دوران فرصت کے لمحات گزار رہا تھا۔

مشہور ٹی۔ وی سیریئل "گُل گلشن گلفام" کے حاجی صاحب جناب پریکشت ساہنی نے جوشؔ ملیح آبادی کا کردار نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے۔ پریکشت ساہنی مشہور ترقی پسند ادیب، نامور کیریکٹر ایکٹر بلراج ساہنی کے ایک باصلاحیت، خوش مزاج اور روشن خیال فرزند ہیں۔ سیریئل "کہکشاں" میں جوشؔ ملیح آبادی کے ایک حصہ کی شوٹنگ میں مشاعرہ بھی شامل تھا۔ اس دور کے شعراء کی حیثیت سے مسرز علی احمد جلیلیؔ، امیر احمد خسروؔ، صلاح الدین نیّرؔ، راشد آذرؔ، رئیس اخترؔ، اکمل حیدرآبادی، منظور احمد

منظور، انجم عارفی، ممتاز منظور، کلیم قریشی، ان پڑھ بمو ٹھکری اور دکی شاداب نے شرکت کی۔ میرے ایک سوال کے جواب میں مسٹر ساہنی نے کہا کہ محفل نگارشن گلفام میری تہذیبی زندگی کا ایک لاقیمت انمول سیہ پل ہے۔ اس سیہ پل کی بدولت میں آج لاکھوں ہندوستانیوں، پاکستانیوں اور بنگلہ دیش کے رہنے والوں کے علاوہ بعض دیگر ممالک کے قدردانوں کی نگاہوں میں عزت و احترام کے ساتھ جانا جاتا ہوں۔ میرا سارا بچپن کشمیر کی پُرکیف وادیوں، سرسبز، خوبصورت و حسین مناظر کو دیکھنے میں گذر گیا۔ میری نس نس میں کشمیر کی تہذیب اور اس کا حسن رچ بس گیا ہے۔ جب ہمارا خاندان بھی ملک کے بٹوارہ کی اذیت ناک صورت حال سے دوچار ہوا تو ہمارے افراد خاندان کو بھی مجبوراً ترکِ وطن کرنا پڑا۔ ہمارے خاندان کے لوگ کچھ اس طرح جذباتی ہو گئے تھے کہ وہ کسی عالم میں بھی اپنی اُس زمین کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے جس میں ہمارے بزرگوں کی سانسوں کی خوشبو اور ان کے جسم کی گرمی بسی ہوئی ہے اور جس نے ہمارے بزرگوں کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا اور جس سے ہمارے اسلاف کی ایک ایک سانس اور ایک ایک پل وابستہ تھا۔ پشاور بھی جب فرقہ وارانہ فساد، دنگے لوٹ مار کا شکار ہونے لگا تو ہمارے خاندان نے کشمیر کا رُخ کیا۔ ان اذیت ناک انسانیت سوز واقعات کے باوجود بھی ہمارے دادا ہربنس لال ساہنی اپنی زمین کا ایک حصہ بننے کے لئے پشاور میں ہی رہ گئے۔ ہمارے دادا ہمارے خاندان کے آخری فرد تھے جو اپنے مادرِ وطن کے دامن سے لپٹے رہے لیکن آخرکار ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وقت پر جان کی بازی لگانے والے مسلمان پڑوسیوں اور دوستوں نے ترکِ وطن کا مشورہ دیتے ہوئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بہ حفاظت میرے دادا کو ہندوستان

کی سرحد پر پہونچا دیا۔ مسٹر ساہنی نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ جب میں نے گل گلشن گلفام سیریل میں کام کرنا شروع کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے والد محترم بلراج ساہنی میری پیٹھ تھپتھپا کر کہہ رہے ہیں کہ بیٹا اپنی زمین کا قرض چکاؤ۔ مجھے حاجی صاحب کے کردار کی حیثیت سے ایکٹنگ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ میں نے اس سیریل میں اداکاری کی ہی نہیں بلکہ حتی الامکان اپنے کردار کو حقیقی روپ دینے کی کوشش کی ہے۔ میں کشمیری زبان، کشمیری تہذیب کشمیری طور و طریق و کشمیری رسم و رواج، وہاں کی آب و ہوا اور وہاں کے موسم سے اچھی طرح واقف ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنی ذمہ داری کو بلا تصنع نبھا سکا جب میں سیریل کے اختتام کے بعد کشمیر سے بمبئی کے لئے روانہ ہوا تھا تو میں نے دیکھا کہ کئی کشمیریوں نے اپنی بھیگی پلکوں سے میرے دامن کو بھگو دیا۔ مجھے روتے ہوئے ان لوگوں نے خدا حافظ کہا، میں بھی مجسم دیدۂ پُرنم بنا ہوا تھا۔

مسٹر ساہنی نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ میں اُردو لکھ پڑھ سکتا ہوں۔ اس زبان کی تہذیب سے واقف ہوں۔ اس زبان کی خوبصورتی، رچاؤ اور دلوں کو چھونے والی کیفیات میری نس نس میں بس گئی ہیں۔ بعض لوگ جان بوجھ کر اُردو کو غیر ملکی زبان کہتے ہیں۔ ایسے لوگ ملک کی یکجہتی کے لئے ایک سوالیہ نشان ہیں۔ اگرچہ میری مادری زبان پنجابی بھی ہے اور کشمیری بھی لیکن میں نے اردو کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ مجھے اپنی تہذیبی زندگی میں اُردو زبان سے ہی سابقہ پڑتا ہے۔ ہماری فلموں اور ٹی۔وی سیریل میں اُردو زبان کا ہی چلن ہے (چاہیں تو لوگ اس کو ہندوستانی بھی کہہ سکتے ہیں)۔ ہمارے خاندان کے بزرگوں کو اُردو زبان

سے بے حد لگاؤ تھا۔ میرے والد بلراج ساہنی بہت اچھی اُردو بولتے تھے، بہت روانی کے ساتھ اُردو میں تقریر کرتے تھے۔ میں گذشتہ ۲۰ سال سے بمبئی میں مقیم ہوں۔ میں اُردو، ہندی، پنجابی، کشمیری اور انگریزی زبانیں جانتا ہوں۔ میرا تعلیمی کیریئر بھی قابلِ رشک رہا ہے۔

حیدرآباد کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد میرے خیال میں ہندوستان کا وہ واحد شہر ہے جہاں کے لوگ اپنی ایک خاص تہذیب کا ورثہ ہیں۔ یہاں کی بھرپور زندگی، یہاں کے لوگ، یہاں کا ماحول سارے ملک میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے جس کے ثبوت میں اپنے ایک دوست وینگ کمانڈر مسٹر پرشوتم (کیرالا) کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ مسٹر پرشوتم سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یہاں تم کیسے؟ اُس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں حیدرآباد سے بہتر کوئی جگہ رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے میں نے یہاں بنگلہ بھی بنالیا ہے۔ پھر مسٹر پرشوتم نے کہا کہ پتہ نہیں یہاں کی مٹی میں ایسی کونسی خاص بات ہے کہ جو بھی یہاں آتا ہے وہ یہیں کا ہوکے رہ جاتا ہے۔

مسٹر پریکشت ساہنی سے گفتگو کرتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک نہایت ہی شائستہ، مہذب، مجسم شرافت، خوش اخلاق، محبت شناس انسان سے محوِ تکلم ہوں۔ وہ شوٹنگ کے دوران بھی ہم شاعروں سے خندہ پیشانی اور بے تکلف فضا میں گفتگو کرتے رہے۔ اُن کا ہنستا ہوا چہرہ، روشن پیشانی، چمکدار آنکھیں اور کشمیری رنگ و روپ نے اُن کی شخصیت کو اور بھی پُراثر اور باوقار بنادیا ہے۔

--

ایک اعلیٰ عہدہ دار اور ممتاز گلوکار

ڈاکٹر جگدیش کلہ

تہذیبی زندگی میں اُردو غزل گائیکی کچھ اِس طرح داخل ہوگئی ہے کہ لوگ اپنے ذوقِ سلیم کی تسکین کے ساتھ ساتھ دن بھر کی ذہنی تھکن دور کرنے کے لئے بھی محفلِ شعر و نغمہ کا رخ کرتے جا رہے ہیں۔ تہذیبی محفلوں میں ہر گلوکار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ غزل سرائی سے اپنے پروگرام کا آغاز کرے۔ آئے دن اخباروں کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ سارے ملک میں جہاں مشاعروں کے ذریعہ اُردو غزل، عوام کے دلوں پر حکومت کر رہی ہے وہیں موسیقی کی محفلوں میں اُردو غزل چھائی ہوئی رہتی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ اکثر تقاریب کا خوشگوار اختتام اکثر دفعہ محفلِ موسیقی پر ہی ہوتا ہے۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کوئی بھی فن ہو وہ خونِ جگر مانگتا ہے۔ ایک اچھا گلوکار کبھی موسیقی کی روایات اور غزل گائیکی کے فن کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔ یہ بھی ایک روایت چلی آ رہی ہے کہ فنِ موسیقی سے وابستہ بعض گلوکار مخصوص سنگیت گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے ذوق و شوق کی تسکین کیلئے

فن موسیقی سے اپنا رشتہ جوڑ دیتے ہیں، ایسے گلوکار اور فنون لطیفہ سے وابستہ بعض ایسے فنکاروں سے بھی ہم استفادہ حاصل کرتے ہیں جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ ایسے فنکار اپنی سرکاری مصروفیات کے باوجود بھی اپنے فن کو اپنے آپ سے جدا نہیں کر پاتے۔ ایسے ہی عہدیداروں میں سے ایک نام ڈاکٹر جگدیش کلہ کا بھی ہے۔ ڈاکٹر جگدیش دسمبر ۱۹۳۸ء میں جودھپور (راجستھان) کے معزز علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے والد محترم جناب رام چند کلہ اردو فارسی کے عالم و فاضل تھے۔ ڈاکٹر جگدیش کلہ کو بھی اردو زبان، اردو شعر وادب اور اردو تہذیب سے گہری وابستگی ہے۔ ڈاکٹر جگدیش کلہ ہر زبان کا احترام کرتے ہیں اور ہر تہذیب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جگدیش کو یہ فن ورثہ میں ملا ہے۔ شمالی ہند کے کلاسیکل موسیقی کے گھرانہ سے ان کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر کلہ نے اپنے والد کی تربیت کے زیر اثر موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد محترم بھی تلفظ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جگدیش کلہ اس لئے کبھی غلط تلفظ کے ساتھ غزل سرا نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر جگدیش کے پسندیدہ گلوکاروں میں سہگل، بیگم اختر، طلعت محمود، مہدی حسن، غلام علی، جگجیت سنگھ وغیرہ ہیں۔ ڈاکٹر جگدیش نے اس فن کو محض اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اپنایا ہے۔

ڈاکٹر جگدیش نے اگریکلچر سائنس میں گریجویشن کیا اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اگریکلچر یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہوئے پھر ۱۹۶۵ء میں اعلیٰ تعلیم کیلئے امریکہ چلے گئے اور وہاں سے اگریکلچر سائینس میں ڈاکٹریٹ کیا OHIUS STATE یونیورسٹی میں اگریکلچرل اور اکنامکس کی تعلیم دیتے رہے۔

امریکہ میں قیام کے دوران ڈاکٹر جگدیش نے مختلف مقاموں پر اداروں کے علاوہ ٹی وی سے بھی اپنے پروگرام پیش کرتے رہے۔ ڈاکٹر جگدیش کو امریکہ کی پرکشش زندگی متاثر نہ کرسکی اور وہ ۱۹۷۹ء میں ہندوستان واپس ہو گئے۔ ڈاکٹر جگدیش کلا اگریکلچرل یونیورسٹی راجندر نگر میں بحیثیت ڈائرکٹر نیشنل اکیڈیمی آف اگریکلچر (نارم) ریسرچ مینجمنٹ کارگذار ہیں۔ ڈاکٹر جگدیش کلا کی غزل گائیکی کا اپنا ایک خاص انداز ہے۔ دور درشن حیدرآباد کے انجمن پروگرام میں ڈاکٹر کلا کی نغمہ ریز آواز اکثر و بیشتر سنائی دیتی ہے۔ وہ ایک یار باش، ملنسار خوش مزاج، خوش اخلاق، خوش گفتار اور خوش صفات انسان ہیں۔ اچھے گلوکار ہیں وہ ایک اعلیٰ آفیسر ہونے کے علاوہ اسٹاف سے ان کا سلوک برادرانہ اور دوستانہ ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں جس شخصیت کے بہت زیادہ عقیدت مند تھے وہ جناب عابد علی خان تھے۔ عابد علی خان صاحب سے انھیں غیر معمولی عقیدت تھی عابد علی خان صاحب بھی ڈاکٹر کلا سے کھل کر بے تکلفانہ گفتگو کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر جگدیش نے یہ بھی بتایا کہ حیدرآباد واقعتاً پیار، محبت، رواداری بھائی چارگی اور عمدہ روایات کا شہر ہے۔ یہاں رہنے بسنے والوں میں قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی محبت کی خوشبو رچ بس گئی ہے۔ ملک بھر کا دورہ کرنے کے بعد جب لوگ حیدرآباد پہنچتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر سانس لے رہے ہیں۔ ==

-٭- -٭- -٭-

جدہ کی تہذیبی زندگی کی مقبول شخصیت

سکندر علی ۔ گلوکار

ایک ایسا فنکار جو اپنی سرزمین کی تازہ خوشبوؤں کو اپنے فن کے ذریعہ عرب ممالک کی فضاؤں میں پھیلا رہا ہو اور ایک ایسا فنکار جو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے اپنے وطن اور اپنے ملک کا نام سربلند کر رہا ہو، اسکی عزت و توقیر اپنے ہم وطنوں اور اپنے ملک کی نگاہوں میں اور بڑھ جاتی ہے ۔

ہمارے شہر کے بہترین دماغ آج بھی امریکہ، کنیڈا، لندن، عرب ممالک اور دنیا بھر کے دیگر ملکوں میں سرگرمی کے ساتھ کارفرما ہیں۔ ہمارے شہر کے با صلاحیت لوگوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا ایک منفرد مقام بنانے کے علاوہ معاشرے کے ترقی یافتہ عوامل میں اپنے آپ کو سمو دیا ہے۔ اگر فنون لطیفہ سے فیض یاب ہونے والے فنکاروں کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں بعض ایسے فنکار بھی ملیں گے جن کی صلاحیتیں ابتداء ہی سے اپنے فن سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہیں ۔ ایسا ہی ایک حیدرآبادی جواں سال خوبرو، خوش لباس اور خوش مزاج شگفتہ اور سلجھا ہوا ممتاز گلوکار سکندر علی ہے جس نے کچھ عرصے سے جدہ، سعودی عرب کی تہذیبی زندگی میں اپنے فن کی بلندی، شگفتگی اور تر و تازگی کی وجہ سے ایک خاص قسم کی کیف اور فضا بنالی ہے

۲۴، ۲۵ برس کا یہ خوش گلو فنکار حیدرآباد سے جب جدہ میں سکونت اختیار کرنے کیلئے ۱۹۸۳ء میں پہونچا اور جس نے وہاں کی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ شروع کیا تو راتوں رات اس کی شہرت سارے عرب ممالک میں پہنچ گئی۔ آج وہ جدہ کی تہذیبی محفلوں میں صف اول کے آرٹسٹ کی حیثیت سے جانا مانا جاتا ہے جس کی صلاحیتوں کے اعتراف میں سعودی اخباروں میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ سکندر علی کے والد محترم ڈاکٹر ظہور علی اگریکلچرل یونیورسٹی حیدرآباد میں ایک لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے علاوہ ویٹرنری ہاسپٹل میں ڈاکٹر کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں جو انڈین یونیورسٹیز فٹ بال کے کیپٹن اور این۔ سی۔ سی میں مسلسل ۴ سال تک گھوڑے سواری کے مقابلے میں رولنگ شیلڈ حاصل کرتے رہے ہیں۔ فٹ بال اور این۔ سی۔ سی کے شعبوں میں انھوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں انھوں نے انٹر یونیورسٹی فٹ بال ٹیم کے کیپٹن کی حیثیت سے افغانستان کا دورہ کیا اور کئی اعزازات حاصل کئے۔ بعد میں انہوں نے سعودی ایرلائینس میں ملازمت اختیار کرلی۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اُن کا ہونہار لڑکا فن موسیقی کا شوقین ہے تو اس کی بھرپور انداز میں حوصلہ افزائی کی۔

سکندر علی نے فن موسیقی میں مشہور اساتذہ سے تربیت حاصل کی جن میں حسن محمد خاں، خواجہ نصیر الدین، طبلہ نواز سلیم خاں اور پاکستان کے مشہور غزل گائیک طفیل نیازی اور منی بیگم قابلِ ذکر ہیں۔ سکندر علی نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجۂ اول میں کامیاب کیا اور آندھراپردیش اوپن یونیورسٹی سے

کرا یجویشن کی تکمیل کی۔ انھوں نے حیدرآباد میں اسکول اور کالج کے موسیقی کے مقابلوں میں کئی انعامات حاصل کئے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ موسیقی کا ذوق و شوق کو بھی جاری رکھا۔ مہدی حسن اور طلعت عزیز نے اُنھیں بے حد متاثر کیا ہے سکندر علی جب غزل سرا ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ ہم مہدی حسن یا طلعت عزیز سے غزل سن رہے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں سوز و گداز، درد و تاثر ہے۔ اُن کی آواز دل میں اُتر جاتی ہے اور سننے والے بس سنتے ہی رہ جاتے ہیں۔

سعودیہ میں اُن کی سرپرستی کرنے والوں میں اُن کے والدین کے علاوہ ای۔ بی۔ یم کمپنی کے منیجر مسٹر آر۔ کے نارائن اور مسز چترا نارائن شامل ہیں۔ ان کے ایک بھائی میوزک ڈائرکٹر ہیں اور ان کے بڑے بھائی کاظم علی جاوید ایک اچھے اداکار ہیں۔ حیدرآباد میں سکندر علی کو آل انڈیا ریڈیو کے نامور استادِ موسیقی حسن محمد نے فن کے مظاہرہ کا موقع فراہم کیا۔ سکندر علی" جناب متقی کی حوصلہ افزائی اور تعاون کے لئے بھی سراپا سپاس ہیں۔ سکندر علی کو بہترین گلوکار بنانے اور ان کی مناسب حوصلہ افزائی کرتے حالوں میں اُن کی دادی کو بہت زیادہ دخل ہے۔ سکندر علی اپنی غزلوں کی دھنیں خود ہی تیار کرتے ہیں۔ جدہ کے سب سے خوبصورت دارالحنان آڈیٹوریم میں سکندر علی نے انڈین فائن آرٹس کے ساتھ کئی شاندار غزل اور فلمی گانوں کے پروگرامس پیش کر چکے ہیں۔ جدہ میں مقیم مشہور خاتون گلوکاروں کے ساتھ بھی وہ اکثر گاتے ہیں جن کے نام مسز چترا نارائن، مسز اُوشا ورما کرشنن اور مسز شیلا لوئیڈرن ہیں۔ سکندر علی نے جدہ کی ہر فائیو اسٹار ہوٹل میں جن میں قابلِ ذکر کاکی ہوٹل، ہوٹل میریٹ، ہوٹل میریڈین ہیں، اپنے

پروگرامس دیئے ہیں۔ سکندر علی نے پروگرامس کے سلسلے میں مسٹر آر۔ نارائن اور مشہور گلوکارہ مسز چترا نارائن کے ہمراہ دو بار اُردن' بغداد اور بصرہ جا چکے ہیں۔ جشنِ حیدرآباد تقاریب جدہ کے تمام کلچرل پروگرامس میں کامیاب پروگرام پیش کر کے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں جنھیں شرکائے محفل نے بہت سراہا۔ جس انداز سے اس فنکار کی اُٹھان ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک دن یہ فنکار صفِ اول کے فنکاروں میں اپنی جگہ بنا لے گا۔ ••

(سیاست" ۱۹۹۱ء)

○

دیارِ شعر و ادب کا ایک معتبر نام

فاطمہ تاج

" فاطمہ تاج آج حیدرآباد کے قلمکاروں کا جانا پہچانا اور معتبر نام بن گئی ہیں۔ وہ اچانک ایک مضمون نگار کی حیثیت سے سامنے آئیں اور اپنے اسلوبِ نگارش اور شوخیٔ تحریر سے پڑھنے والوں میں ایک مقام پیدا کرلیا ہے۔ فاطمہ تاج کو چند سال قبل کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں جب ان کے مضامین سیاست کے لئے منتخب کرتا تو مجھے خود حیرت ہوتی کہ یہ اب تک کہاں چھپی ہوئی تھیں۔ میں انہیں صاحبِ طرز ادیب دیکھنا چاہتا ہوں۔" — یہ اقتباس ممتاز صحافی و دانشور جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست کی تحریر کا ہے، جو فاطمہ تاج کے پہلے مجموعۂ کلام "اب کے برس" کی اشاعت کے معنوی حُسن میں اضافہ کررہا ہے۔

آج جب میں فاطمہ تاج کے بارے میں لکھنا چاہ رہا ہوں تو مجھے عظمت عبدالقیوم کی بہت یاد آرہی ہے۔ جب کوئی باصلاحیت اہلِ قلم خاتون، محفلِ خواتین سے وابستہ ہوجاتیں تو عظمت آپا کو بے حد خوشی ہوتی تھی۔ عظمت عبدالقیوم، جو اپنے پیاروں، سچے موتی اور ہیروں کی تلاش و جستجو میں ایک خوشگوار مسرت محسوس کرتی تھیں۔

فاطمہ تاج آج اپنی تازہ کاری اور تازہ خوشبو سے گلستانِ شعر و ادب کو مہکا رہی ہیں۔ ایک ذہین و فطین شاعرہ اور صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں اہمیت اختیار کرتی جارہی ہیں۔

"آب کے برس" کے پیش لفظ میں پروفیسر مغنی تبسم نے اس طرح تاثر دیا ہے۔

"اردو کی تازہ وارد شاعرات کی فہرست میں فاطمہ تاج کا نام ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ غزل کی صنف سے انہیں زیادہ لگاؤ ہے، انہوں نے اردو کے کلاسیکی غزل گو شعراء کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی احساسات و جذبات کی جھلک جابجا نظر آتی ہے۔

"آب کے برس" فاطمہ تاج کی شاعری کا نقشِ اول ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک منفرد لہجہ اور اسلوب کی تلاش میں ہیں اور اس میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ ان کے اشعار میں فکر و احساس کی تازگی کے ساتھ اظہار کی ندرت اور برجستگی ہے"

فاطمہ تاج کی یہ پہلی تحریر جو محفلِ خواتین کی شامِ غزل کا آنکھوں دیکھا حال' کی شکل میں سیاست میں شائع ہوئی تو پڑھ کر میں بے حد متاثر ہوا اور خاص طور پر تحریر کے اس حصہ سے فاطمہ تاج کو دل کی گہرائیوں سے خراجِ تحسین پیش کیا۔

"اچانک . . . . نے اعلان کیا کہ بہتر ہوگا کہ شاعرات مائیک پر آکر خود اپنا تعارف کروائیں، دل حلق میں اٹک گیا۔ ماحول گھومنے لگا۔ ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ شاعری شیر بن کر سامنے آگئی۔ اچانک ایسے میں ایک آواز آئی۔ مناسب نہیں، ہرگز مناسب نہیں

میں نے گردن پھیر کر اس فرشتے کو دیکھنا ضروری سمجھا، صلاح الدین نیر
نیر قدامت پسند گھرانے کی بہو بیٹیوں کے سر سے آنچل سرکتا دیکھ کر
اپنے خلوص و احترام کی چادر ڈال چکے تھے، وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ
محفلِ خواتین کے لئے کسی بھی طرح باعثِ عزت نہ ہوگا۔ اور ان کے
انکار سے بات وہیں ختم ہو گئی۔"

فاطمہ تاج کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "آس پاس" کا پیش لفظ ممتاز دانشور
ڈاکٹر حسن الدین احمد نے لکھا ہے جو فاطمہ تاج کے فن اور شخصیت کا بھرپور جائزہ ہے
اقتباس نذرِ قارئین ہے۔

"آس پاس" فاطمہ تاج کے (۳۰) افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے
ان کی غزلوں کا مجموعہ "اب کے برس" شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ
کے عنوان ہی نے مجھے پکار دیا تھا۔ اہلِ ذوق شخصیتوں نے نہ صرف
اس شعری مجموعہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا بلکہ اس کا ادبی فضاء
میں تازہ ہوا کی حیثیت سے خیر مقدم کیا اور شاعرہ کو نیا چہرہ، نئی پہچان
قرار دیا۔ اس شعری مجموعہ کو دیکھ کر میرا یہ تاثر تھا کہ فاطمہ تاج کو شاعرانہ
مزاج فطرت سے ودیعت ہوا ہے لیکن اب ان کے افسانوں کو دیکھنے
کا موقع ملا تو یہ انکشاف ہوا کہ فاطمہ تاج ایک باصلاحیت شاعرہ ہی نہیں
بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کی نثر نگار اور بھرپور فنکار بھی ہیں۔ جہاں تک فاطمہ تاج
کی شخصیت کا تعلق ہے وہ ادراکِ انکسار و شرافتِ نسوانی اپنا تعارف
کرواتے میں کم آمیز ہیں، حالانکہ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے

ان کی شخصیت میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ فاطمہ تاج کے خسر حبیب حسن بالاقیصر سے میری دیرینہ واقفیت تھی اور ان سے نہایت گہرے اور برادرانہ مراسم تھے۔ اس تعلق سے فاطمہ تاج کو میں بہو کا درجہ دیتا تو نامناسب نہ ہوتا لیکن اردو ادب میں ان کے مقام کے پیش نظر میں ان کو "ان دیکھی بیٹی" کہہ سکتا ہوں۔ زیر نظر افسانے فاطمہ تاج کی شخصیت کی غمازی کرتے ہیں، وہ فطرت اور کائنات سے اپنا ناطہ جوڑی ہوئی ہیں۔ ان کے اطراف جو لوگ بستے ہیں، حتی کہ ان کے شوہر اور ان کی اولاد، کسی کو بھی ان کی اندرونی دنیا، ان کے جذبات اور خیالات کا پتہ نہیں۔ سب یہ جانتے ہیں کہ فاطمہ کے ہاتھ میں قلم ہے اور ان پر کچھ دھن سوار ہے۔ اس سے آگے وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ فاطمہ کے اندرونی احساسات سے سب ناواقف ہیں۔ ان معنی میں فاطمہ تنہا ہیں۔ جب ان کی شاعرانہ اور فنکارانہ کیفیت ان کے خیالات میں طلاطم برپا کرتی ہے تو وہ اشعار اور افسانوں کو اظہار کا ذریعہ بناتی ہیں اور اپنے تاثرات کو قلم بند کرتی ہیں۔ جس طرح ان کے خیالات اور ان کا نظریہ حیات ان کی شاعری سے عیاں ہے۔ اسی طرح ان کی شخصیت اور ان کی نفسیاتی کیفیت ان کے افسانوں میں بکھری نظر آتی ہے۔ میں نے نہ صرف ان کے افسانوں کو بنظر غائر دیکھا بلکہ بین السطور باتوں تک بھی پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ سیدھی سادی زبان میں لکھے گئے افسانوں کے موضوع

بے جان نہیں ہیں، ان کو خونِ جگر کی آویزش اور قلم کے ماہرانہ استعمال سے ایسا رنگ دیا گیا ہے کہ ان کی سانسوں کی گرمی اور دل کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں۔ یہ سارے کردار جیتے جاگتے انسان اور جانی پہچانی شخصیتیں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا فیصلہ کر زخمی پاؤں سے ٹھوکریں لگا کر پتھروں کو راستے سے ہٹانے میں وہ کہاں تک کامیاب ہو سکی ہیں' معزز قارئین پر رکھا ہے۔ میں ان افسانوں کے ایک قاری کی حیثیت سے بہ بانگِ دُہل یہ فیصلہ دیتا ہوں کہ فاطمہ تاج نے نہ صرف سنگِ راہ کو ٹھوکروں سے ہٹایا ہے بلکہ انہیں بہت دور پھینک دیا ہے۔"

"آندھرا پردیش کی نامور ممتاز ادیبہ صالحہ الطاف (مدیر خاتونِ دکن) کی پُر اثر تحریر بھی قابلِ مطالعہ ہے:-

"جس مٹی کی خوشبو کو فاطمہ تاج گزشتہ کچھ برسوں سے محسوس کر رہی ہیں اُس مٹی کو میں نے عمر کے ایک طویل عرصہ تک محسوس کیا ہے۔ فاطمہ تاج سے میرا ایک جذباتی رشتہ ہے" (اقتباس)

مجھے یاد ہے کہ معتمد محفلِ خواتین ممتاز ادیبہ فاطمہ عالم علی خاں نے مجھے فاطمہ تاج کے کلام کی اشاعت کے لئے توجہ دلائی تھی، انہیں کے مشورہ سے فاطمہ تاج کا مجموعۂ کلام اشاعت کے لئے مجھ تک پہونچا۔

جب بھی صالحہ الطاف (صالحہ آپا) سے گفتگو کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں فاطمہ تاج سے گفتگو کر رہا ہوں۔ وہی انداز، وہی تہہ دار گفتگو، وہی پُر معنی

طرزِ تکلم، وہی بانکپن اور وہی والہانہ پن جو ایک پُروقار معتبر خاتون کا انمول زیور سمجھا جاتا ہے۔ فاطمہ سے میرا وہی رشتہ ہے جو عظمت عبدالقیوم سے شروع ہو کر کویتا کرن پر ختم ہوتا ہے۔ فاطمہ سے گفتگو کے دوران کبھی کبھی عظمت عبدالقیوم، صالحہ الطاف، ریحانہ، شفیقہ قادری، مظفر النساء ناز، انیس قیوم فیاض، انجم نکہت، انجم قمر سوز، ناہید سحر اور کویتا کرن، کے چہرے سامنے آجاتے ہیں اور مجھے ان کے کبھی ختم نہ ہونے والے پاکیزہ رشتہ کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔

فاطمہ تاج کو علمی، ادبی، دینی و تاریخی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ کثرتِ مطالعہ نے فاطمہ کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا ہے۔ فاطمہ ایک گھریلو خاتون ہونے کے باوجود دیارِ شعر و ادب کی پُرکشش فضاؤں سے پوری طرح واقف ہیں۔ ادبِ عالیہ سے انہیں خاص شغف ہے۔ ان کی تخلیقات اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ وہ معاشرے کے خدوخال میں گہرا رنگ بھرنا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ معاشرہ کی ہر صبح و شام سے اپنے آپ کو پوری طرح وابستہ کرتے ہوئے پُروقار انداز میں سانس لیتی رہیں۔ فاطمہ کے جذبات، احساسات، تخیلات، تجربات اور مشاہدات میں زندگی کی ایک ایسی حرارت ملتی ہے جو ساری کائنات کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہے۔ زندگی کی حرارت کو وہ ہر لمحہ محسوس کرتی ہیں۔ مزاج کی شائستگی، طبیعت کی شگفتگی اور ذاتی شرافت نے ان کی شخصیت کو قابلِ توجہ اور پُراثر و ذی وقار بنانے میں مکمل تعاون کیا ہے۔ خدا نے انہیں ہر موضوع پر چاہے وہ ادبی ہو کہ تہذیبی، سیاسی ہو کہ معاشرتی، اظہارِ خیال کی صلاحیت سے سرفراز کیا ہے۔ دل کی دولت فاطمہ کا اپنا عظیم سرمایہ ہے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر فاطمہ کے خیالات کا ترجمان

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

فاطمہ کے دل میں کسی کام کے کرنے کا جذبہ اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اُبھر کر آتا ہے۔ ایک سال میں تین کتابوں کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ فاطمہ تاج ارادہ کی پکی ہیں اور جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہیں کر گذرتی ہیں۔ دل کا فیصلہ فاطمہ کا آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ انسان دوستی، دردمندی، خلوص بے پایاں، وارفتگی اور حسن سلوک کے بارے میں دل اُن کا بہترین دوست ہے۔ مجھے فاطمہ کے علمی و ادبی کاموں سے دلچسپی لیتے ہوئے بے حد مسرت محسوس ہوتی ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ فاطمہ کی ہر خواہش پوری ہو، اور وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے ذوق و شوق کو اسی طرح جاری رکھے۔ فاطمہ اپنی ہر تازہ تخلیق مجھے فون پر سنایا کرتی ہیں (اللہ کا یہ بھی ایک انداز ہے)۔ جب مجموعۂ کلام کی اشاعت کی منزل قریب آئی تو میں نے فاطمہ کا مسودہ بہ غور دیکھا اور جہاں کہیں کوئی ضرورت محسوس کی نوک پلک سنوارتی گئی۔ فاطمہ خوش گو، زود گو شاعرہ ہے۔ بہت کم ان کے کلام میں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ فاطمہ کی تخلیقات ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن فاطمہ کی پہچان روزنامہ سیاست میں ان کی شائع شدہ تخلیقات سے ہوئی۔ اللہ نے اُن میں ایک ایسی صلاحیت ودیعت کی ہے کہ وہ چلتے پھرتے شعر کہتی ہیں۔ ایک ہی نشست میں ۱۰-۱۵ منٹ کے اندر مضمون لکھ دیتی ہیں یہ میرا مشاہدہ ہے اس لئے یہ بات ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔

صدر محفل خواتین ممتاز شاعرہ و ادیب سلطانہ شرف الدین احمد نے فاطمہ کو کچھ اس انداز سے دیکھا اور محسوس کیا ہے اور اس طرح اُن کی شخصیت اور فن کا جائزہ

لیا ہے۔ قارئین توجہ فرمائیں۔

"محفلِ خواتین کا اجلاس شروع ہوا چاہتا تھا، خواتین آتی جا رہی تھیں ہر چہرہ تھکا تھکی سی نظر آ رہی تھی۔ میں ہال میں داخل ہوئی، دیکھا بہت سی خواتین جانی پہچانی ہیں۔ آداب سلام کے بعد میں اپنی نشست پر جا بیٹھی۔ آج ایک نیا چہرہ دعوتِ نظر دے رہا تھا، کسی قدر غور سے دیکھا۔ شکل جانی پہچانی لگی۔ اچانک دو نئی آنکھیں چار ہوئیں۔ دیکھنے کے انداز میں تیکھا پن تھا، شرارت کی چمک تھی۔ دبی دبی مسکراہٹ نے متوجہ کر لیا۔ ایک یقین سا اُبھرا، جیسے میں ان آنکھوں اور ان کے دیکھنے کے انداز سے آشنا ہوں، جانتی ہوں۔ گویا میری یادداشت میں رہ گئی تھیں یہ آنکھیں۔ میں نے سوچا یہ ہنس مکھ چہرہ ضرور میرے شاگردوں کے کارواں میں شامل رہا ہوگا۔ جب بھی نظریں ملتی ہیں احتراماً جھک جاتی ہیں تجسس سا پیدا ہوا مگر میری کھوج نے صبر کے دامن میں پناہ لی۔ یہ ایسا لمحہ نہ تھا جس میں اس جذبہ کی تشفی کی جاتی۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ مضمون، افسانہ، شاعری سبھی کچھ تو ہو رہا تھا۔ محفل اختتام کو پہنچی اور یہ گستاخ آنکھوں والا شریر چہرہ میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ تعارف سے پتہ چلا کہ وہ میرے اولین شاگردوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ذرا سی لڑکیاں کس قدر سُرعت سے بڑھ جاتی ہیں کتنی جلد چھوٹ پھاٹ کے اونچی پوری ہو جاتی ہیں۔ ہر ادا میں عورت پن اس قدر رس بس جاتا ہے کہ کسی چھوٹی سی لڑکی کو عورت کے سانچے میں ڈھالنا اور پھر شناخت کرنا واقعی مشکل ہو جاتا ہے مگر حافظہ اُن کے کمسن حلیہ کو محفوظ کیے ہوتا ہے۔

فاطمہ تاج کی اور میری یہ رسمی باقاعدہ ملاقات تھی۔ پہلی ہی بار وہ محفلِ خواتین کی

گرویدہ ہوگئیں۔ انہیں عورتوں کے اظہار کا یہ بے باک ماحول پسند آیا۔ فاطمہ بے تحاشہ اس کی ممبر بن گئیں۔ پھر کیا تھا، ادبی اجلاس میں نئے چہرے اُن کے ساتھ آنے لگے۔ ناغہ کرنا تو کجا وہ وقت سے پہلے ہی موجود رہتیں اور ہنس ہنس کر میرا خیر مقدم کرتیں۔ استاد شاگرد کے رشتے کی تقدیس، خلوص، محبت اور دوستی میں تبدیل ہوتی رہی۔ فاطمہ تاج کے کلام میں تازگی جھلکتی ہے، شادابی محسوس ہوتی ہے۔ کسی جھیل سے اُبھرنے والی ننھی ننھی لہروں کی خوبصورتی نظر آتی ہے یا کسی دریچے کے اچانک کھل جانے سے تازہ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے رُک رُک کر چلے آئیں اور فرحت بخشیں۔ اکثر اشعار نے ایک پیچھے ڈھکے دُکھ کے پس منظر کا احساس دلایا۔ ایک ایسی محرومی کی ترجمانی بھی کی جسے پوشیدہ رکھنے کے باوجود شعور کے کسی گوشے سے بے اختیار جھانکنے لگتی۔ الغرض فاطمہ تاج اُبھرتی ہوئی شاعرہ ہیں، شعر کہنے کا سلیقہ ہے۔ اشعار آورد کے نہیں آمد کے ترجمان ہیں۔ خیالات کے اظہار میں ٹھہراؤ اور رکاوٹ نہیں۔ کثرتِ مطالعہ نے ان کے اشعار کو بوقلمونی اور تر و تازگی عطا کی ہے"۔

فاطمہ تاج کے افسانوں کے مجموعے "آس پاس" پر تبصرہ کرتے ہوئے سلطانہ شرف الدین نے فاطمہ کے فن کو یوں خراج پیش کیا ہے۔

" فاطمہ کے افسانے "آس پاس" نمودار ہو چکے ہیں۔ اُنھوں نے شعر و نثر کی وسعتوں کو انتہائی سرعت سے طے کیا ہے۔ تین سال قبل محفلِ خواتین نے ان کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی، جب ایک بار وہ کاشانۂ ادب کے چھوٹے سے ہجوم میں داخل ہو گئیں، اہلِ ذوق نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہمت افزائیوں

اور قدردشناسیوں نے فاطمہ تاج کی شخصیت کو شعر و ادب کی راہوں کا چراغ بنا ڈالا۔

۱۶۲ صفحوں میں ان کے ۳۰ افسانے نظر بند ہیں، اندازِ تحریر میں روانی، سادگی اور جاذبیت ہے۔ توجہ کے تار ٹوٹنے نہیں پاتے۔ فاطمہ تاج کی شبیہ ان کی شخصی خصوصیات اور ان کا کردار، تحریر کے آئینہ میں واضح نظر آتا ہے۔ قدامت پسند ماحول کی پرورش، لڑکپن کی شرارت و خوش خیالی، بدحالی یا دوں کے ان مٹ نشان، تلخ تجربوں سے نفسیاتی دکھ سب ہی ان کی تحریر سے جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔ فاطمہ نے زندگی کے تجربوں کو اپنی بے ساختہ اندازِ تحریر میں سمیٹ لیا ہے۔"

صفیہ شاہین ایم۔اے، محفلِ خواتین سے وابستہ ہیں انہوں نے فاطمہ تاج کی "امانت" کے بارے میں یوں لکھا ہے ....

"فاطمہ تاج کی تیسری کتاب "امانت" ان کے نثری مضامین، خاکے، انشائیے، رپورتاژ، نثر پارے اور متفرق تحریروں پر مشتمل ہے۔ ایسے حالات میں جبکہ حیدرآباد نے اپنے چار سو سال پورے کئے۔ شمالی ہند میں ایک چار سو سالہ قدیم عمارت ڈھے گئی۔ اس عمارت کے ساتھ ہی کتنی لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگی، حوصلوں میں پستی آئی۔ مگر کچھ باحوصلہ لوگوں نے اپنا قدر سمندر میں قطرہ کی طرح محسوس کی اور اپنے تعمیری کام میں جٹ گئے۔ شاید ان ہی لوگوں میں فاطمہ تاج کی بھی گنتی ہو سکے۔ کیونکہ کچھ حوصلہ انہوں نے بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ "پانی میں کنکریاں پھینک کر لہریں تو ضرور پیدا کی جا سکتی ہیں لیکن طوفان تو نہیں اٹھائے جا سکتے۔" لیکن اگر ان کی تازہ تصنیف پانی میں پھینکی گئی کنکریاں ہیں

تو اس وقت کی بے بسی کے دور میں طوفان ہی ہیں کیوں کہ آج کا ماحول خود ان کی زبان میں کچھ اس طرح ہے " مہنگائی کی سنگلاخ چٹانوں سے سب ٹکرا رہے ہیں۔ سب ہی کے پاؤں زخمی ہیں۔ مگر کسی کو اپنے زخموں سے بہتے ہوئے خون کی پرواہ نہیں۔ وہ کہتی ہیں ' میں اپنے شہر کے ان مضطرب لوگوں کو دیکھ رہی ہوں جو بظاہر بستے بساتے نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندر کی ویرانیاں صحرا سے کم نہیں۔ ان دوڑتے ہوئے قدموں پر میری نظر ہے جو بے انتہا تھک گئے ہیں۔ مگر پھر بھی چلنے پر مجبور ہیں۔ اگر رک جائیں تو ہجوم انہیں دھکا دے کر گرا دے گا۔

ممتاز دانشور، سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی جناب سید ہاشم علی اختر فاطمہ تاج کی نثری تخلیق " امانت " کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

میں فاطمہ تاج سے شخصی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن کوئی دو سال ہوتے حیدرآباد کے ادبی افق پر ایک مشکل سے نظر آنے والا ہلال فاطمہ تاج کی شخصیت میں نمودار ہوا اور اس مختصر سی مدت میں ایک شاعری کا مجموعہ " آپ کے برس " (۱۹۹۲ء) اور ایک افسانوں کا مجموعہ " آس پاس " (۱۹۹۳ء) اور بہت سے مضامین، خاکے اور انشائیے شائع ہوتے رہے اور اب ان کا یہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ یعنی ہلال ادب ' بدر کامل ' بننے کی مسلسل کوشش میں ہے۔

ان کی پچھلی دو کتابوں پر حیدرآباد کی ادبی دنیا کی کئی شخصیتوں نے رائے دی ہے جن میں محبوب حسین جگر، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر حسن الدین احمد

سلطانہ شرف الدین، بانو طاہرہ سعید، فاطمہ عالم علی خاں، صالحہ الطاف اور ڈاکٹر اختر سلطانہ جیسی شخصیتیں شامل ہیں جن سے فاطمہ تاج کی جاذب نظر شخصیت، ذہانت، کلام کی تکنیک اور خوش اخلاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حیدر آبادی تعلیم یافتہ خواتین کی ایک باوقار انجمن "محفلِ خواتین" ہے جس میں حیدرآباد کی اکثر سینئر ادیب اور شاعر خواتین شامل ہیں، فاطمہ تاج نے بہت ہی کم عرصے میں بڑی ہر دلعزیزی حاصل کرلی ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہونگی، جنھوں نے اتنے قلیل عرصہ میں سماجی اور ادبی دنیا میں ایک واضح مقام حاصل کرلیا ہے لیکن صاف گوئی سے لکھے ہوئے خود اپنے تعارف "بیا بانگِ دہل" کو پڑھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اسکول اور کالج کی باقاعدہ تعلیم نہ ہونے، قدامت پرست گھرانے میں پیدا ہونے اور کسی قدر کم قدامت پرست سسرال کے ماحول کے باوجود جیسے کنول اور کٹر قدامت اور دقیانوسی روایات کے سمندر کو ہر شاہوار ہونے کے باوجود اپنی ساری خوبیوں سمیت تہہ میں مٹ جاتی۔ فاطمہ تاج نے اس شیشے کی دیوار پہ جو تازہ ہوا کو آنے سے روکتی تھی، دیا لبریز گلاس دے مارا اور اس خوشبو دار نرم ہوائیں بہنے لگیں جو برسوں شیشے کی دیوار کے پیچھے رکی ہوئی ان کا انتظار کر رہی تھی۔

ذہین اور حساس شخصیت میں جو شعریت بھری ہوئی تھی اور خیالوں میں جو افسانے بنتے اور بگڑتے رہتے تھے وہ شعروں، افسانوں اور مضامین کی شکل میں اس تازہ ہوا کی مدد میں آکر پھیلنے لگے۔ بہت سے خواب ضبطِ تحریر

میں آئے۔ بہت سے شخصی تجربے، افسانوں کی شکل میں لکھے جانے لگے۔
مجھے محبوب حسین جگر کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ "فاطمہ تاج اردو کی ایک صاحب طرز ادیبہ بن جائیں۔" اس لئے کہ اردو والوں کے موجودہ سماج میں ایسے لکھنے والوں کی کمی ہے جو اس سماج کے مسائل، اس کی کمزوریوں اور اُن کے حل کے لئے ایک حساس دل، ایک غور و فکر کرنے والا دماغ اور ایک متاثر کن طرزِ تحریر رکھتے ہوں۔

فاطمہ تاج کے خاتون اہل قلم دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن بعض ایسی کچھ ہیں جو فاطمہ کو بہت قریب سے محسوس کرتی ہیں۔ فاطمہ نے روابط اور دوستی کے فرق کو محسوس کرنے کے لئے کوئی فہرست تو نہیں بنائی لیکن ان کے طرزِ بیان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک گوشہ ایسا بھی ہے جس میں کچھ لوگ انتہائی خلوص کے ساتھ رونق افروز ہیں۔ رشتوں کی پاسداری میں فاطمہ اپنی آپ مثال ہیں۔ مزاج کی شائستگی، خوش رہنے اور خوش دیکھنے کے مراحل سے گذرتی رہتی ہیں۔ فاطمہ تاج ایک شائستہ نثر، باصلاحیت، معتبر و سلیقہ مند شاعرہ ہیں۔ دنیوی تجربات نے اُن کے قلم کو روانی بخشی ہے۔ محفلِ خواتین سے وابستگی نے فاطمہ کو اپنی پہچان، اپنی شناخت کے لئے زیادہ وقت نہیں دیا پھر سیاست میں فاطمہ کے کلام اور تحریروں کی اشاعت نے ہمارے ادبی حلقے کو متوجہ کیا ہے مجھے اس بات کا احساس رہتا ہے کہ قارئینِ سیاست، فاطمہ تاج کی تحریروں کو پڑھنے کے منتظر رہتے ہیں۔ فاطمہ تاج کا ادبی سفر جاری ہے خوشبو کی طرح، دل کہتا ہے کہ فاطمہ کا یہ سفر کبھی رکنے والا نہیں ہے۔ خدا کرے کہ یہ سفر کبھی رکنے نہ پائے۔ ؎ سمندروں سے بھی آگے نکل گیا ہے کرن

**

ترکِ وطن کے بعد بھی

پروین کمال

"ایسا بھی نہیں ہے کہ لوگ جب اپنا وطن چھوڑ کر تلاشِ معاش اور اپنے بہترین مستقبل کی آبیاری کے لئے دوسرے ملکوں کو چلے جاتے ہیں تو وہاں کے حالات اور ماحول سے اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر پاتے، لیکن اس کو کیا کیجئے کہ کچھ لوگ ترکِ وطن کرنے کے برسوں بعد بھی اپنی زمین کا ایک حصہ بنے رہتے ہیں۔ میں بھی اُن ہی زمینی لوگوں میں سے ایک ہوں۔ لاکھ کوشش کے بعد بھی میں وہاں کے معاشرہ کا مکمل جزو نہ بن سکی۔ پتہ نہیں کیوں ۱۴ برسوں سے وطن سے دور رہنے کے باوجود بھی میں اپنے آپ کو نئے ملک اور نئے ماحول سے پوری طرح ایڈجسٹ نہ کر سکی۔ جسمانی طور پر تو میں فرانکفرٹ (جرمنی) میں رہتی ہوں لیکن ذہنی طور پر اپنے وطنِ عزیز سے کبھی دور نہیں رہتی۔ میرے رفیقِ حیات مصطفےٰ کمال صاحب میرے اس نظریہ سے پوری طرح متفق ہیں۔ وہ جرمنی میں ایک باصلاحیت، ذہین و فطین کمپیوٹر انجینئر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اگرچہ کہ جرمنی میں ہمیں وہ تمام مادی و عصری سہولتیں، آسائشیں اور راحتیں میسر ہیں لیکن دل و دماغ اپنے وطن کی بھینی بھینی خوشبو سے مہکے ہوئے رہتے ہیں۔"

اِن خیالات کا اظہار ممتاز جواں سال ادیبہ پروین کمال نے انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں کیا۔ ان کے اندازِ گفتگو میں دھیما پن، نرمی اور

شگفتگی ملتی ہے۔ جملوں کی ادائیگی میں بے ساختگی کے ساتھ ساتھ روانی بھی پائی جاتی ہے۔ بادقار لب و لہجہ سے شائستگی ٹپکتی ہے۔ انداز تخاطب پُر اثر کیفیت چھوڑتا چلا جاتا ہے۔

پروین کمال نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ انھوں نے حسینی علم گرلز ہائی اسکول سے میٹرک کیا اور جامعہ عثمانیہ سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ اسکول اور کالج کی طالب علمی کے زمانے میں ادبی و تہذیبی سرگرمیوں سے دلچسپی ضرور تھی لیکن عملاً حصہ نہیں لیا۔ شادی کے بعد کمال صاحب کے ساتھ جرمنی چلی گئی۔ جہاں پاکستان کے اخبارات و ادبی رسائل میرے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ پھر میں نے جرمنی زبان سے واقفیت حاصل کرنی شروع کی۔ شروع شروع زبان کا مسئلہ میرے لئے ایک الجھن کا باعث بنا۔ لیکن میں نے بہت جلد جرمنی سیکھ لی۔ اب میں اچھی طرح جرمنی زبان میں لکھی ہوئی تحریریں پڑھ سکتی ہوں۔ جرمنی لکھ سکتی ہوں۔ رفتہ رفتہ میں نے جرمنی ادب و تہذیب کے مختلف النوع گوشوں سے واقفیت حاصل کرلی ہے۔ انگریزی ادب میں بھی بہت سی کتابیں مل جاتی ہیں یہ سب کچھ رہتے کے باوجود ایک خلاء سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں حیدرآباد کے حالات سے پوری طرح واقف ہونے کے لئے بے چین رہا کرتی تھی۔ پھر مجھے اتوار اور پیر کے سیاست سے ذہنی سکون کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کی تسکین بھی حاصل ہوتی رہی۔ سیاست میں میرا پہلا مضمون "آج کا جرمن" ۵ر نومبر ۱۹۸۹ء کو شائع ہوا۔ اس کے بعد سیاست میں میرے "۱۳" مضامین شائع ہوئے۔ "خلیجی جنگ" میرا تیرہواں مضمون تھا جو ۲۴ر مارچ ۱۹۹۱ء کو شائع ہوا۔ میرے

مضامین کے موضوعات عموماً سیاسیات، اقتصادیات اور سماجیات پر مبنی رہتے ہیں۔ علمی و ادبی مصروفیات میں بھی کمال صاحب میرے معاون اور میرے ہم خیال ہیں۔ ہم دونوں میں ایک ذہنی ہم آہنگی ہے۔ میں وہاں کوئی جاب نہیں کرتی۔ گھر کے کام کاج سے فراغت پانے کے بعد کتابوں، رسالوں، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے دوستوں میں میرا وقت گذرتا ہے۔ اتوار اور پیر کے سیاست کا مجھے بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ مجھے سیاست (۱۰) دن کے بعد ملتا ہے، لیکن آخری دو دنوں میں بے خیالی کے عالم میں بار بار لیٹر باکس کے پاس چلی جاتی ہوں۔ جب سیاست پڑھتی ہوں تو یوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں حیدرآباد میں ہوں، اپنے لوگوں، اپنے رشتہ داروں اور اپنے دوستوں کے ساتھ۔ سیاست پڑھنے کے بعد کافی دیر تک اپنے آپ کو حیدرآباد سے وابستہ کرتی ہوں۔ اخبار سیاست ہم جیسے تارکان وطن کے دل سکون کے لئے بہت بڑا ذریعہ ہے۔ پروین صاحبہ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجھے اخلاقی، ادبی و تہذیبی مضامین پڑھنے کے علاوہ شعری ادب کے مطالعہ کا بھی شوق ہے۔ اچھی شاعری سن کر اور پڑھ کر متاثر ہو جاتی ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں خاص طور پر ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی مشاعرے بڑے شوق سے سنتی رہی ہوں۔ عابد علی خان صاحب سیاست اور ادبی ٹرسٹ کے ذریعہ اردو زبان کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں وہ ناقابل فراموش ہے۔

پروین کمال نے ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ فرانکفرٹ (جرمنی) میں حیدرآباد کے صرف (۷) خاندان رہتے ہیں۔ سارے جرمنی میں پاکستانیوں کی کافی تعداد ہے۔ ہندوستانیوں میں زیادہ تر پنجاب اور دہلی کے لوگ رہتے ہیں۔ بہت کم ایسا

ہوتا ہے کہ ہم حیدرآبادی یار ملتے رہے ہوں، البتہ کوئی خاص تقریب ہو تو ہم لوگ مل لیتے ہیں۔ ویسے بھی وہاں لوگوں کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ رشتوں کو نبھائے رکھیں۔ بڑے ملکوں کی طرح جرمنی میں بھی انسان مشین بن گئے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے مسائل میں اُلجھے ہوئے رہتے ہیں۔ آباد شہروں میں لگتا ہے کہ لوگ تنہائی کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا احساس انسانی رشتوں کے لئے ایک سوالیہ نشان بنتا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی کافی دیر تک یہی سوچتے رہتے ہیں کہ ہمیں وہاں کب تک رہنا ہوگا۔ بہرحال ایک دن تو ہمیں اپنے وطن لوٹنا ہی ہے لیکن کب، طے کرنا مشکل ہے۔ ہمیں سب کچھ حاصل ہے لیکن ذہنی سکون حاصل نہیں ہے۔ (دل اور دماغ میں جنگ جاری ہے)۔ ان ۱۳ برسوں میں ۶ مرتبہ حیدرآباد آچکی ہوں۔ اب کی بار ۳ سال کے بعد آئی ہوں۔ ایک ماہ اور رہنے کا خیال ہے پتہ نہیں پھر کب آنا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ پردیس میں انسان کو صرف یادوں کا ہی بڑا سہارا رہتا ہے، چاہے وہ یادیں تلخ ہوں کہ امرت برسانے والی ہوں۔ ۔۔

(۱۹۹۰ء)

سیاست

آہنگِ شعر

(فن اور صناعتِ شعر پر ایک جامع کتاب)

مصنف: پروفیسر ابوظفر عبدالواحد

زیرِ تبصرہ کتاب "آہنگِ شعر" پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کی علمی و ادبی زندگی کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ فنِ شعر اور علم عروض پر اس عالمانہ مقالہ کو اُردو اکیڈیمی آندھراپردیش نے اپنے اشاعتی پروگرام کے تحت نہایت سلیقے سے شائع کیا ہے۔

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کا شمار مستند اساتذۂ سخن، صاحبِ بصیرت نقادوں اور ماہرین علم عروض میں ہوتا ہے۔ فنِ شاعری پر پروفیسر صاحب کے خیالات کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو اکیڈیمی قابلِ مبارک باد ہے کہ اُس نے ایک ایسے گوشہ نشین اور کم آمیز ادیب کی کتاب شائع کی جو اپنی قلندرانہ روش کی وجہ سے ادبی نام و نمود سے زندگی بھر بے نیاز رہا ہے۔ پروفیسر صاحب کی ساری زندگی درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ رہی۔ پرنسپل [illegible] کالج کی حیثیت سے بھی ظفر صاحب نے اُردو زبان و ادب کی بے حد اہم خدمت انجام دی ہے۔

"آہنگِ شعر" مصنف کے تجربے اور تحقیق کا ایک لاجواب شاہکار ہے۔ ظفر صاحب

نے اس فن کو نہ صرف برسوں پڑھایا ہے بلکہ اس فن کو سلیقے سے برتا بھی ہے۔

"نشانِ آہنگ" کے عنوان سے انہوں نے جو اشعار تحریر کئے ہیں وہ اس فن کے ساتھ ان کی لگن اور جاں کاہی کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ –

سوختم جاں را پئے نیرنگِ شعر
سینۂ در اندوختم آہنگِ شعر
سالہا خوردم ہزاروں پیچ و تاب
از تب و تابم بنا شد ایں کتاب
قصۂ سود و زیاں دامن مپرس
ایں چہ گونہ ! آں چناں از من مپرس

ظفر صاحب کو ہمیشہ اپنی وضع داری کا پاس رہا۔ قلندرانہ طبیعت، فقیرانہ روش ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ظفر صاحب نے آہنگِ شعر میں عروض اور فنِ شعر کے ہر نکتہ اور ہر مسئلہ پر کھل کر گفتگو کی ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ پروفیسر صاحب کو کندن بننے کے لئے کتنے برس تک اس فن کی آگ میں جلنا پڑا ہوگا۔ اردو، انگریزی، عربی، فارسی اور ہندی زبان و فن پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے شاعری کے مختلف نکات کو بہت عمدگی سے سمجھایا ہے۔

حرفِ اول میں مصنف نے شاعری کے بارے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

"شاعری، شدتِ احساس سے عبارت ہے اور شعر وہی جو کانوں میں رس گھولتا ہوا دل میں اتر جائے۔ شعر کی معنویت اپنی جگہ مسلّم لیکن شعر

میں غنائیت نہیں تو اچھا خاصا احساس گو کہ دھندلا ہو کر رہ جاتا ہے
جس طرح بصیرت بے بصارت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی اسی طرح غنائیت
اور نظم و آہنگ کے بغیر معنویت چوپٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ شعر کا سچا پارکھ
وہی ہے جو شعوری طور پر نہ سہی تو غیر شعوری طور پر نظم و آہنگ کا دلدادہ ہو۔"

پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد نے آہنگِ شعر کے صفحات سے اس بات کا احساس بھی دلایا ہے کہ ایک اچھے تخلیق کار کے لئے فنی نکات، فنی رموز اور فنی اصولوں سے کس حد تک باخبری ضروری ہے۔ ایک شاعر کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ نظم و آہنگ کے اصولوں سے بے اعتنائی نہ برتے اور غلط فہمی میں نہ رہے کہ

شعر می گویم بہ از آبِ حیات
من نہ دانم فاعلاتن، فاعلات

کسی فن سے ناواقفیت کو اپنی بے نیازی کا نام دینا ایک اچھے شاعر کے لئے کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ ایک فنکار کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس کو اپنے فن سے آگہی اور عرفان حاصل رہے۔

آہنگِ شعر، حسبِ ذیل ۵ ابواب پر مشتمل ہے۔
۱۔ تجزیۂ آہنگ ۲۔ موازنۂ آہنگ ۳۔ آہنگِ قوافی ۴۔ آہنگِ معرّا ۵۔ تشریحِ آہنگ

آہنگِ شعر، ہر اردو لائبریری کی زینت بڑھائے گی۔ اس کتاب سے استفادہ ہر اس شاعر کے لئے ضروری ہے۔ چاہے وہ کلاسیکی شاعری کا دلدادہ ہو، ترقی پسند ادب کا عاشق ہو یا جدیدیت کا پرستار۔

==

اذکار (مضامین کا مجموعہ)

(پروفیسر آزاد گلاٹی)

تقسیم ملک کے بعد سرزمینِ پنجاب کی نئی نسل کے جن شاعروں اور ادیبوں نے پنجابی زبان کے ساتھ اُردو زبان سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھا اُن میں سے ایک نام پروفیسر آزاد گلاٹی کا بھی ہے۔ پروفیسر آزاد گلاٹی نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں وہ گھرانہ علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ اُن کے بزرگوں نے روایتی اندازِ فکر اور تہذیبی اقدار کو بہر قیمت ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اِس دورِ بے یقینی میں بھی پروفیسر آزاد گلاٹی کے خاندان کے لوگ اُردو زبان کو اپنی تہذیب کا ایک حصہ بنائے ہوئے ہیں۔

پروفیسر آزاد گلاٹی اُردو حلقوں میں ایک شاعر کی حیثیت سے ہی ملک گیر شہرت کے حامل نہیں ہیں بلکہ اُنہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ملک کے بیشتر اُردو اکیڈمیوں نے اُن کی کتابوں کو ایوارڈز سے نوازا ہے۔ ہندوپاک کے ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ اُنہیں ملک بھر کے مشاعروں کے علاوہ متحدہ عرب امارات کے مشاعرے پڑھنے کا بھی فخر حاصل ہے۔

اگرچہ کہ آزاد گلاٹی جدید رجحانات کے شاعر ہیں لیکن ہر اچھے شاعر کی طرح

اُنہوں نے کلاسیکی شعروادب سے اپنا رشتہ باقی رکھا ہے۔ وہ جدیدیت کے طرزِ فکر کو اپناتے ہوئے بھی ادب کی قدیم عمدہ روایتوں سے استفادہ کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ایک اچھا شاعر، ایک بہترین اُستاد، بہترین نقاد اور محقق ہو سکتا ہے۔ آزاد گلاٹی ایک منفرد لب و لہجہ کے شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں جس کا ثبوت اُنہوں نے زیرِ تبصرہ کتاب "اذکار" سے دیا ہے۔

آزاد گلاٹی گورنمنٹ کالج (نابھا) (پنجاب) میں انگریزی کے اُستاد ہیں۔ انگریزی زبان پر انہیں دسترس حاصل ہے۔ فارسی، ہندی شعروادب میں بھی انہیں ملکہ حاصل ہے۔ اُردو میں اُن کے تین (۳) شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ آغوشِ خیال (۱۹۶۳ء) جسموں کا بن باس (۱۹۷۱ء) تکون کا کرب (۱۹۷۳ء) "دشتِ صدا (۱۹۷۶ء)۔ ہندی میں تین کتابیں "تمہاری باتیں" (اُردو کلام ۱۹۶۶ء)۔ نئے موسموں کے گلاب (اُردو کلام ۱۹۸۵ء) اور کلاکار کی مرتبہ کہانیاں ۱۹۵۹ء) شائع ہو چکی ہیں۔ پنجابی میں اُردو کلام "نئے موسموں کے گلاب" زیرِ ترتیب ہے۔

"اذکار" آزاد گلاٹی کے حسبِ ذیل چھ مضامین کا مجموعہ ہے۔

۱۔ اُردو ادب میں قومی یک جہتی

۲۔ پنجاب کا کلچر اور اُردو ادب

۳۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں پنجاب کا اُردو ادب

۴۔ آزادی کے بعد پنجاب کا اُردو شعری ادب۔

۵۔ پرچھائیاں ۔ پنجاب تعمیر قادری۔

۶۔ جمال محمد صوفی اتفاق ۔ حیات اور شاعری ۔

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو، فارسی و عربی کے پروفیسر حفیظ اللہ جاوید نے کتاب کے پیش لفظ میں کہا ہے کہ ۔۔

"آزاد گلاٹی انگریزی کے پروفیسر ہیں لیکن ان کی شخصیت کا اظہار اردو میں ہوا ہے ۔ آزاد ہمارے ان شعراء میں سے ہیں جنہوں نے شعر گوئی کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق کو بھی اپنا میدان بنایا ہے ۔ ان کا مطالعہ مغرب و مشرق کے ادب کا بہت گہرا ہے ۔ اور ادبی تاریخ کے ارتقاء پر بھی ان کی نظر ہے ۔ انہوں نے انتہا پسندی یا ذاتی عقیدت پسندی کا رویہ اختیار نہیں کیا ہے ۔ ان مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں ایک تہذیب و تمدن کا دور اپنے گذشتہ ادوار سے مدد لے کر آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اور جس کے نقوش قارئین کو ادب میں تغیر پذیر ہونے والے رجحانات کا بھرپور احساس دلاتے ہیں ۔ آزاد کا رشتہ جدیدیت سے ہے لیکن وہ ماضی کے ادب کو اسی عہد کے تناظر میں پرکھتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں ۔"

"اذکار" کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد گلاٹی کو صرف اردو شاعری سے ہی دلچسپی نہیں بلکہ وہ تاریخ ادب اردو، اردو تنقید و تحقیق سے بھی بہرہ ور ہیں ان کی معلومات اس قدر وسیع ہیں کہ ان کی تخلیقات کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس

ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے مطالعہ کا زیادہ حصہ اُردو زبان اور اُردو تہذیب کو سمجھنے کے لئے وقف کیا ہے۔

ادب کا چاہے وہ کوئی بھی شعبہ ہو وہ اہلِ قلم سے متوقع رہتا ہے کہ اُس سے انصاف کیا جائے بے راہ روی، غیر ذمہ دارانہ اندازِ فکر اچھے اور ذہین قلمکاروں کو اپنے منصب سے ہٹا دیتا ہے۔ آزاد گلاٹی نے شاعری کی طرح نثر نگاری میں بھی متوازن اور محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ اُن کا ناقدانہ لب و لہجہ بھی متاثر کن ہے۔

"اذکار" میں شامل پہلا مضمون اُردو ادب میں قومی یک جہتی" ہے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس نے بہ قول مولانا ابوالکلام آزاد "آج تک کسی کلچر کے اپیلے نقوش کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ ہندوستان نے ہمیشہ دوسرے ثقافتی عناصر کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے"۔ آزاد گلاٹی لکھتے ہیں کہ اُردو زبان و ادب کی خوش قسمتی ہے کہ صوفیوں اور درویشوں کی دعائیں بھی ملیں۔ بہ قول گوپی چند نارنگ "یہ وہ زبان ہے جس کی ملتی جلتی شکلوں میں بھگتوں، سنتوں، اور صوفیوں نے توحید کے ترانے گائے۔ خواجہ معین الدین اجمیری چشتی ہوں یا حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاء ہوں یا خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، رامانند ہوں یا تکارام، کبیر ہوں یا نانک، سینکڑوں صوفیوں، سنتوں اور اولیاء اللہ نے صحیح معنوں میں اس زبان کی سرپرستی کی۔ہے۔

اس سیر حاصل مضمون میں آزاد نے اُن تمام محسنینِ اُردو کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے قومی یک جہتی کی فضا بنانے میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ دوسرا مضمون "پنجاب کا کلچر اور اُردو ادب" ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے پنجاب کے نامور

شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال، سسی پنوں، مرزا صاحبان پورن بھگت، روپ بسنت وغیرہ کے مخصوص حوالے بھی دیئے ہیں۔ ان پیار کرنے والوں کی داستانِ محبت کے اردو تراجم نے پنجاب کے کلچر کو اردو میں منتقل کرنے کا کام کیا ہے۔ اور پنجاب کے تخلیق کاروں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

تیسرا مضمون "مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں پنجاب کا اردو ادب" ہے۔ اس مضمون میں بتلایا گیا ہے کہ پنجاب کے اردو شعراء نے آزادیٔ وطن کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے ہندوستان کی سیاسی و معاشی تحریک میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا ہے اور جب یہ خواب ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو شرمندۂ تعبیر ہوا تو اس کے تصور ہی سے وحشت سی ہونے لگی۔ ملک کی تقسیم کے وقت ایک گہری سرخ لکیر پنجاب کے سینے پر کھینچ دی گئی اور آگ اور خون کا وہ طوفان اٹھا جس کی مثال مہذب انسان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس مضمون میں سرزمینِ پنجاب سے وابستہ تمام اہم شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچواں باب 'پرچھائیاں' ایک تجزیاتی مطالعہ ہے۔ ساحر لدھیانوی کی اس معرکۃ الآرا نظم کی تمام خصوصیات، محرکات، اسلوب اور ہیئت کا تفصیلی ذکر ہے کہ جس کے مطالعہ سے ساحر کی شاعرانہ فضیلت کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب کا آخری مضمون' سرزمینِ پنجاب کے جدید لب و لہجے کے شاعر بمل کرشن اشک ۔ حیات اور شاعری" ہے۔ اس مضمون میں بمل کرشن اشک کی شاعرانہ عظمت کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے اردو کے اس اہم شاعر کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ آزاد نے بمل کرشن اشک کے فن کو اس طرح خراج پیش کیا ہے:-

"اشک روایت کو مسترد نہیں کرتے۔ ایسا کرتے تو غزل کہتے ہی کیوں؟" — اپنی ایک غزل میں وہ کہتے ہیں۔ "ماں کو ماں کہتے بنتی ہے۔ غزل کو وہ کوثر و تسنیم کے ساحلوں سے گنگا و جمنا کے کناروں تک لے آئے۔"...

اشک کی ایک تحریر کا حوالہ اس طرح دیا ہے :-

"جدید شاعری ان دونوں (کلاسیکی شاعری اور ترقی پسند شاعری) کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔" اشک کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ہم بھی اُن راتوں میں تھالی پر دیا رکھ کر چلے
جب شوالے کی عمارت کا کوئی در وا نہ تھا

-:- -:- -:-

(سیاست ۸۹ء)

"روشن لکیریں" (مجموعۂ کلام)

ڈاکٹر صادق نقوی

صادق نقوی، حیدرآباد کے اُن جواں سال شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ۱۹۶۰ء میں شہری و ادبی محفلوں میں اپنے آپ کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے روشناس کروایا۔ ویسے وہ ۱۹۵۵ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اِدھر کچھ برس خاموش رہنے کے بعد اب وہ پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی انفرادیت منواتے ہوئے ہماری محفلوں پر چھا رہے ہیں۔

صادق نقوی اپنی شائستہ مزاجی، شگفتہ لہجے، بالغ نظری اور شاعرانہ بانکپن کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر، پھولوں کی تازگی، بادِ صبا کی انگڑائی اور پہلی برسات کی خوشبو سے زیادہ مانوس ہے۔ شاعر کے کلام میں زندگی کی سچائی ہے۔ ماحول کی کشاکش اور حالات کی بے راہ روی سے وہ کبھی بھی دامن کشاں نہیں رہا۔ صادق ایک با صلاحیت شاعر ہی نہیں بلکہ سلجھے ہوئے مقرر اور شائستہ و متوازن ادیب کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ ذہن کی پاکیزگی، روشن ضمیری، شاعر کی نس نس میں بسی ہوئی ہے۔

اچھی بات یہ ہے کہ شاعر اپنے فن کو کسی خاص ازم میں شامل کرنا نہیں چاہتا۔ شاعر کو کسی خاص اسکول سے اپنے آپ کی وابستگی کا اصرار بھی نہیں ہے۔ لیکن "روشن لکیریں" کے بہ غائر مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر کلاسیکی ادب کا احترام کرتے ہوئے عصری حسیت کو بھی اپنے فن کا جز بنا چکا ہے۔

ان کے کلام میں جدید و قدیم کا ایک حسین اور دلکش امتزاج ہے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے "روشن لکیریں" صادق نقوی کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس منتخب مجموعۂ کلام میں شاعر کے دل کے دھڑکنے کی صدا ہر ورق پر آپ کو سنائی دے گی۔

ہے یادگار، محبت بھرے زمانے کی
وہ ایک ساعت محسوس دل دکھانے کی

تمام عمر کرے ناز، فطرتِ خود دار
نصیب ہو جو سعادت انہیں منانے کی

اسی اُمید پہ نیند اُڑ گئی ہے اے صادق
کبھی تو جاگے گی قسمت غریب خانے کی

ایک دو گام پہ منزل تھی سفر کیا کیجے
ہم ہی پھرتے رہے آوارہ خیالوں کی طرح

دہلیز پہ کھڑے ہیں اُمیدوں کے قافلے
جی چاہتا ہے درد کے ماروں میں بانٹ دوں

اپنی انا کی لاش لئے اپنی گود میں
خنجر کی تیز دھار پہ چلتا ہے آدمی

--

"کانچ کا شہر" (مجموعۂ کلام)

فیض الحسن خیالؔ

گذشتہ ۲۰، ۲۲ سال میں حیدرآباد کے جن شاعروں نے اردو شعروادب میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا ہے اُن میں سے ایک معتبر نام فیض الحسن خیالؔ کا بھی ہے۔ خیالؔ اپنے شاعرانہ مزاج، نرم گفتاری، سنجیدگی، شائستگی اور مخصوص اندازِ گفتگو کی وجہ ہمیشہ اپنے احباب کا مرکزِ نگاہ بنے رہتے ہیں۔ خیالؔ بھی اُن خوش نصیب شاعروں میں سے ایک ہیں جو علمی و ادبی حلقوں میں اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ خیالؔ کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ وہ کئی کُل ہند مشاعرے پڑھنے کے علاوہ ٹی۔وی اور ریڈیو پر اپنا کلام سناتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب "کانچ کا شہر" حیدرآباد کے مقبول شاعر فیض الحسن خیالؔ کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ پہلا مجموعۂ کلام "موجِ صبا" ۱۹۶۵ء اور دوسرا مجموعۂ کلام "صبح کا سورج" ۱۹۷۳ء میں شائع کرواکر ادبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ "کانچ کا شہر" کے غائر مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خیالؔ نہایت اعتماد کے ساتھ زندگی کی جیتی جاگتی علامتوں کو چھوتے ہوئے اپنا شعری سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے کلام میں زندگی کے نشیب و فراز سے باخبری، ماحول کی

بے راہ روی سے بیزارگی اور معاشرے کی نکہ ادائی پر نشتر زنی کے عنصر نمایاں ہیں۔

"موجِ صبا" کی رسم اجراء کے موقع پر ممتاز ترقی پسند ادیب خواجہ احمد عباس نے خیالؔ کے فن کو اس طرح سراہا ہے۔

"فیض الحسن خیالؔ، خوبصورت غزل کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ادب میں جمود طاری ہے، فیض الحسن خیالؔ کا کلام پڑھنے کے بعد یہ نہ کہہ سکیں گے۔ خیالؔ کی غزلوں اور نظموں میں بڑا ہی حسن اور تاثر ہے۔ غزل گو شاعر اور نظم نگار شاعر دونوں حیثیت سے ان کا مزاج ہم آہنگ ہے۔"

ــ ڈاکٹر مسعود حسین خان سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے خیالؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا یوں اعتراف کیا ہے:۔

"فیض الحسن خیالؔ حیدرآباد کی اس نئی پود سے تعلق رکھتے ہیں جن کی نوا میں بانکپن، تخیل میں تابِ پرواز ہے جو نقدِ دل سے سودا کرنا جانتی ہے۔"

ــ ڈاکٹر زینت ساجدہ کے تاثرات کچھ اس طرح ہیں:۔

"فیض الحسن خیالؔ، میدانِ غزل میں نووارد سہی مگر تازہ وارد نہیں، اس لئے اُسے سنبھال کر چلتے ہیں۔ وہ آدابِ فن کی خاطر نہ فن کو قربان کرتے ہیں نہ حُسن کی خاطر ظاہر سے لاپرواہی برتتے ہیں۔ خیالؔ کے ہاں ایسے شعر نظر آتے ہیں جو آج بھی، کل بھی اور کل کے بعد بھی لطف دیں گے۔ خیالؔ نے اپنے دور کے جذبات

کو اچھی طرح محسوس کیا ہے ۔ وہ کارواں کے گم کردہ راہی کو بھی
جانتے ہیں اور اس کے اسباب سے بھی باخبر ہیں ۔ "

۔ جناب عابد علی خاں نے اس طرح خیالؔ کے فن کی نشان دہی کی ہے :
" خیالؔ کی شاعری عصرِ جدید کے اس انسان کے جذبات کی ترجمانی
کرتی ہے جو مشینوں کی گڑگڑاہٹ، فائیلوں کے انبار اور نا آسودہ
تمناؤں کے پہاڑ تلے اپنی انفرادی آواز کی کھوج میں ہے ۔
ان کے مجموعے کے صفحات پر ہمارے دلوں کی دھڑکنیں جذب ہیں ۔ "

۔ ممتاز شاعر و نقاد ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے " کانچ کا شہر "
کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :-

" فیض الحسن خیالؔ " جدید دور کے شعرائے حیدرآباد میں نمایاں
مقام رکھتے ہیں ۔ خیالؔ کو غزل کی صنف سے زیادہ لگاؤ ہے ۔
اور وہ اس کے ادا شناس بھی ہیں ۔ جن احساسات کو اپنی شاعری
میں پیش کیا ہے وہ ان کے سماجی اور سیاسی اقدار کی ترجمانی
کرتے کے ساتھ کہیں کہیں موجودہ دور کے انسان کی وجودی صورتحال
کی عکاسی بھی کرتے ہیں ۔ "

" کانچ کا شہر " کے کچھ شعر قارئین کے ملاحظہ کے لئے پیش ہیں ۔ ان
اشعار کے ملاحظہ سے قارئین خود اندازہ لگالیں گے کہ ہمارا شہر کسی دور میں
بھی تہی دامن نہیں رہا ۔

کانچ کے شہر میں پتھر نہ اٹھاؤ یارو   میکدہ ہے اسے مقتل نہ بناؤ یارو

زندگی بیچنے چلی ہے بازارِ دنیا میں — اس بہانے سے کبھی کچھ دام نکلا ہو یارو
نوید صبح کی تاریخ لیے آنکھوں میں ہم — ابھی تو آنکھوں میں باقی کا دھواں ہے میاں
بتاؤ کون ہے منصور کی تلاش میں اب تو — ہر ایک شخص صلیبوں کے درمیاں ہے میاں
یہ شور ہے ہمارا نئی سحر کے لئے — کرن کرن کی ہو تقسیم ہر نظر کے لئے
یہ جانتا ہوں کہ پتھر کہاں سے آتے ہیں — تجھے خبر نہیں تیرا بھی گھر مثالی ہے
تمام رات مسیحا سے گفتگو میں کٹی — سحر ہوئی تو ہوئے قتل اپنے آنگن میں
جو آئینے کے مقابل ہیں وہ بتائیں گے — نوید صبح کا کیا حشر ہونے والا ہے
آج کی بات نہیں سوچ لو کل کیا ہوگا — کچھ نئے نام ابھر آئے ہیں مے خانوں میں
میں نے تنہائی کے دروازے پہ دستک دی تھی — جو کھلا در تو وہاں اپنا ہی چہرہ دیکھا

==

ذائقہ میرے لہو کا (مجموعۂ کلام)

شمیم فاروقی

ادھر کچھ برسوں سے چاہے وہ جدید شاعر ہو کہ جدید تر شاعر، اپنی فکر کو صنفِ غزل سے مربوط و وابستہ کرتا جارہا ہے۔ اب مشاعروں میں نظمیں کہنے والے شاعر کم ہوتے جارہے ہیں۔ ہر مکتبۂ خیال کے شاعر کے ہاں نظموں کے مقابلے میں زیادہ تر غزلیں ہی ملیں گی۔ اس بات کا اندازہ آئے دن شائع ہونے والے شعری مجموعوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ غزل کا فن، خونِ جگر مانگتا ہے۔ ایک خاص خیال کو دو مصرعوں میں خوبصورتی اور تاثر کے ساتھ سمو دینا غیر معمولی آرٹ سمجھا جاتا ہے۔ غزل کا اچھا شاعر فنی باریکیوں اور نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے فکر و خیال کو کبھی مجروح ہونے نہیں دیتا۔ جو بات ایک طویل نظم کے ذریعہ کہی جاتی ہے۔ غزل گو شاعر صرف دو مصرعوں میں وہ بات کہہ جاتا ہے۔

شعری کیفیات اور فنی نزاکتوں کے پس منظر میں اگر "ذائقہ لہو کا" کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہوگی کہ شمیم فاروقی نے فن کا احترام کیا ہے۔ یوں ہی تفریحاً شعر نہیں کہے ہیں۔ شمیم فاروقی کی شاعری اس لئے پسند کی جائے گی کہ انہوں نے نہایت خلوص کے ساتھ اپنے احساسات، جذبات کو شعری

پیکر عطا کیا ہے اور جہاں تک ان کے شاعرانہ مزاج کا تعلق ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مکتبِ خیال کی نمائندگی نہیں کرتے۔ یعنی اُن کے کلام میں کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ ترقی پسند رجحانات اور عصری آگہی کی وہ تمام خصوصیات مل جاتی ہیں، جن سے قاری کے ذوقِ سلیم کی تسکین ہو جاتی ہے شائد اسی تاثر کی وجہ سے ظہیر احمد کے قلم سے یہ جملے ادا ہوئے۔

"شمیم کو ضد ہے کہ وہ ماضی کی کتھا دہرائی جائے تاکہ قارئین اُن کی شاعری کے پس منظر سے واقف ہو سکیں، ماضی کے ٹوٹے پھوٹے لہولہان لمحوں کو دیکھ سکیں جس کی تیشہ زنی نے اُن کو شعر کہنے پر مجبور کیا۔ شمیم شعر و سخن کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ شمیم نے شاعری کو کبھی فیشن نہیں سمجھا"

ظہیر احمد، شمیم فاروقی کے الفاظ دہراتے ہیں کہ "میں جو کچھ بھی ہوں والدہ کی نظرِ عنایت اور شفقت کا ثمرہ ہے۔" شمیم کے مستقبل کی تشکیل میں اُن کی والدہ کا بڑا حصہ ہے۔ اُن کے مزاج میں جو سنجیدگی اور متانت ہے اور شعری اظہار میں جو ایک خاص تہذیب کارفرما ہے وہ بھی اُن کی والدہ کی تربیت کے زیرِ اثر ہی ہے۔ شمیم نے اپنے بارے میں یہ شعر لکھا اور کہا ہے۔

کوئی تو سنگِ ملامت ہی پھینکنے آتا
خدا کے فضل سے یہ شاخ بے ثمر بھی نہیں

"میرے پاس صحیح معنوں میں لکھنے کے لئے کچھ بھی نہیں، پھر بھی

غرض حال کے طور پر کچھ لکھنے کی خواہش ضرور رہی، کیونکہ پیش لفظ لکھوانے کا میں کبھی قائل نہیں رہا، مگر جب لکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہیں سے کوئی سرا نہیں ملتا، جس کی زندگی تھی خانوں میں بٹی ہوئی ہے جس کو نہ ماضی کا علم نہ حال کی خبر، جس کا مستقبل نامعلوم وہ اپنے بارے میں لکھ بھی کیا سکتا ہے، اس لئے میں اپنا قلم اس کے سپرد کرتا ہوں، جو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، وہ ہیں ظہیر صدیقی ــــ شمیم نے کتاب کا انتساب اپنی والدہ کے نام کرتے ہوئے فارسی کا یہ مصرع لکھ دیا ہے ؎

"جز آستان توام درجہاں پناہے نیست"

"دائرہ میرے لہو کا" کے یہ کچھ شعر قارئین کی نذر ہیں۔

اُن کے سب کچھ نقش، قدموں کے نشاں لے جائیگا ‌ ‌ ‌ اس سفر کی ہر نشانی کارواں لے جائے گا

مجھ کو خوش کرنے کی خاطر دور سے آیا تھا وہ ‌ ‌ ‌ کتنے موتی اپنی پلکوں پر سجا کر لے گیا

ہر چند تیز دھوپ میں جلتا رہا بدن ‌ ‌ ‌ لیکن گیا نہیں مرے چہرے کا بانکپن

ان کے ستم شناس اداؤں کے باوجود ‌ ‌ ‌ اک عمر کاٹ دی ہے انہیں دوستوں کے ساتھ

جہاں تھے وہیں پر کھڑے رہ گئے ‌ ‌ ‌ جو اپنی ہی ضد پر اڑے رہ گئے

ندی عورتوں کو بہا لے گئی ‌ ‌ ‌ کناروں پر خالی گھڑے رہ گئے

بشر بھوک سے تلملاتا رہا ‌ ‌ ‌ خزانے زمیں میں گڑے رہ گئے

ایک ایک کر کے پرندے اڑ رہے ہیں شاخ سے ‌ ‌ ‌ ایسا لگتا ہے کہ جیسے موسم گل جائے گا

افکارِ شفیق (مجموعۂ کلام)

شفیق الہ آبادی

اُردو شعر و ادب کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غزل کی شاعری ہر دور میں اپنا لب و لہجہ بدلتی رہی ہے۔ ہر مکتبۂ خیال کا شاعر، اپنی فکر، اپنے تجربے، مشاہدے اور اپنے ذوقِ سلیم سے اپنی شاعری کو الفاظ کا پیرہن عطا کرتا ہے۔ اُردو شعری ادب میں ہمیں ایسے بھی بیشتر شاعر ملیں گے جنھوں نے کبھی بھی اپنے اندازِ فکر، شعری رویے اور اپنی افتادِ طبیعت کو نہیں بدلا۔ حالانکہ اُن ہی کے دور میں شعری ادب میں نئے نئے تجربے ہوتے رہے ہیں۔ نئے حالات، نئے تجربوں کا ان کی شاعری پر کچھ بھی اثر نہیں پڑا۔ ایسے ہی شاعروں میں سے ایک شاعر شفیق الہ آبادی بھی ہیں۔ شفیق الہ آبادی نے شاعری کی قدیم روایات کو اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ نوح ناروی جیسے اُستادِ فن کے شاگرد رشید ہیں۔ نوح ناروی نے اپنے استاد داغ دہلوی کی شاعرانہ روش کو کھلے ذہن و فکر کے ساتھ اپنایا تھا۔ شفیق الہ آبادی کے کلام سے میں نے جو تاثر قبول کیا ہے اُس کے ثبوت میں حسبِ ذیل اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

ہزار بار نہیں سو ہزار بار نہیں
ہمیں تمہاری محبت پہ اعتبار نہیں

یہ نرالی چھیڑ دیکھو میرا دل لینے کے بعد
کہتے ہیں وہ اور بھی دل کا سہارا ملا مجھے

اب اُن کے میرے عشق کا مشکل ہے فیصلہ
میں جانِ زندگی ہوں کہ وہ جانِ زندگی

وہ عالم بھی زمانہ ہے میرے شباب کا
قصہ نہ میں سنوں گا عذاب و ثواب کا

وہ نکلے سفر کے سرِ شام جب نکلتے ہیں
قمر بھی دیکھتا ہے اُن کو چشمِ حیرت سے

شفق سے رغبت ہے تکلف سے مجھے کام نہیں
میرا چلو تو ہے موجود مگر جام نہیں

شفیق الٰہ آبادی ایک روایت پسند، وضع دار شاعر تھے۔ آج کا سامع/قاری جس قسم کی شاعری پسند کرتا ہے، شفیق الٰہ آبادی کی شاعری سے اُسے مایوسی ہوگی اس لئے کہ اُن کے اشعار میں نہ کوئی نیا پن ہے نہ اچھوتا انداز اور نہ ہی چونکا دینے والی کوئی بات ہے۔ اشعار کی بندش بھی ایسی نہیں ہے کہ جو آج کے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہو سکے۔ لیکن بزرگوں کے ایک ورثے کی طرح ایسی شاعری کی بھی قدر کرنی چاہیئے۔ اسی لئے ایسے ورثے کے تحفظ کے لئے اُن کی برسوں کی ریاضت شامل ہے۔

پروفیسر سید عقیل احمد نے کتاب کے ابتدائی صفحات میں لکھا ہے کہ حضرت شفیق کا تعلق الٰہ آباد کے اُس دور سے ہے جب یہاں کے دورِ شاعری میں اُستادی اور شاگردی کی روایت بہت مضبوط تھی۔ اس طریقہ سلسلہ چاہے کچھ اور کیا ہو یا نہ کیا ہو! مگر نو آموزان شعر و سخن کو زبان اور رموزِ شاعری میں ایسا پختہ کیا کہ عام طور پر اُن کا کلام شعری اسقام اور زبان و بیان کے اُلجھاؤ سے ہمیشہ پاک رہا۔ اُس دور کی شاعری پر سب سے گہرا اثر حضرت نوح ناروی کا ہے۔

شفیق بھی حضرت نوح ناروی کے شاگرد تھے، اُن سے ملنے کا موقع مجھے اپنے استاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے ساتھ برابر ملتا۔"

جناب راز الٰہ آبادی نے بھی مختصراً شفیق الٰہ آبادی کی شاعری پر قلم اٹھایا ہے۔ حصہ نثر میں سب سے جاندار حصہ اجمل اجملی کا ہے۔ شفیق بھائی کے عنوان سے اجمل اجملی نے ۱۵ صفحات پر مشتمل مضمون لکھا ہے۔ اس جامع مضمون کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شفیق صاحب کی نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے قدر کرتے ہیں بلکہ ایک بہترین انسان کی حیثیت سے بھی انہیں خراج پیش کیا ہے۔ اجمل اجملی نے اپنی دانشوری کا ثبوت دیتے ہوئے الٰہ آباد کی شعری و ادبی محفلوں کا اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں الٰہ آباد کی جن مشہور ادبی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے اُن کے اہم نام یہ ہیں۔ مظفر شاہجہاں پوری، وامق جونپوری، پروفیسر عقیل رضوی، مصطفیٰ زیدی، ڈاکٹر اعجاز حسین وغیرہ۔

"سیاست"

○

خوں بہا (مجموعہ کلام)

(یوگیندر بہل تشنہ)

کلاسیکی اقدار کو بزرگوں کا لازوال ورثہ سمجھتے ہوئے علم و ادب کی ترویج و اشاعت میں جو لوگ ہمہ تن معروف ہیں وہ بھی قابلِ مبارکباد ہیں اور وہ بھی قابلِ مبارکباد ہیں جو زبان و تہذیب کی ہر نازک مرحلہ پہ پاسداری کیا کرتے ہیں۔ شعری ادب میں ہیئت و مواد کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شعراء اپنے اپنے احساسات و جذبات کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں لیکن کامیاب وہی شاعر سمجھے جاتے ہیں جو زندگی کی مثبت قدروں کو دیانت داری کے ساتھ اپنے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ جو شاعر کلاسیکی ادب سے رشتہ رکھتے ہوئے ترقی پسندانہ ذہن و فکر اور عصری حسیات سے آگہی رکھتا ہو، وہ اپنی بات صاف اور واضح انداز میں کہہ سکتا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "خوں بہا" کا شاعر ان تینوں خوبیوں سے بہرہ ور ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی "تشنگی کا شاعر" کے زیرِ عنوان اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

> ان کی شاعری کا بیشتر حصہ وہ ہے جہاں معلومات نے محسوسات اور تصورات نے تاثرات کا رنگ اختیار کر لیا ہے جس کے بغیر شعر نہیں بنتا۔ اس میں شامل غزلیں اور نظمیں ہماری نئی زندگی میں تہذیبی

اور فکری خوف بھائی محسوسیت کی طرف قدم قدم پہ اشارہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی نظموں کو پڑھنے اور ان سے اثر قبول کرتے وقت یہ سچائی بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ شاعر نے ان نظموں کو اسٹیج سے لئے نہیں لکھا ہے۔ اس نے اپنی تنہائیوں اور دروں دل کی گہرائیوں میں ان واقعات کے مثبت اثرات کو آبی دائروں کی طرح جنم لیتے وقت کی پنہائیوں میں آگے بڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور اسے قومی زندگی کی عقدہ کشائی سے تعبیر کیا ہے۔"

اس مجموعہ کی زیادہ تر نظمیں، قومی یک جہتی، دہشت گردی، فرقہ پرستی مادر وطن کے موضوعات سے متعلق ہیں۔ بعض نظمیں اس کتاب میں شخصیات پر بھی ہیں۔ نظموں میں شاعر کا لب و لہجہ کہیں تو جارحانہ ہے اور کہیں ناصحانہ۔ کہیں کہیں شاعر جس ماحول میں سانس لے رہا ہے اور جن حادثات سے دوچار ہے وہی باتیں انہوں نے اپنے اشعار میں کہی ہیں۔

"خوں بہا" میں مہاتما گاندھی کے یوم شہادت پر "کنفیوژن" کے عنوان سے بھی ایک تاثراتی نظم موجود ہے۔ وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی کی شخصیت، اُن کی قومی خدمات اور اُن کی حب الوطنی پر ۴ نظمیں شامل ہیں۔ ایک اور تاثراتی نظم لیبیا پر حملے کے پس منظر میں ریگن (صدر امریکہ) سے تخاطب کے عنوان پر شامل کتاب ہے۔

تشنہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن اُنہوں نے غزلیں بھی بہت عمدہ کہی ہیں۔ کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تشنہ نے اُردو ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ سیدھے سادے انداز میں اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔

کتاب کے ابتدائی صفحات میں نالۂ اردو کے نام سے ایک نظم شریک ہے۔ شاعر سے اُردو زبان کو یہ شکایت ہے کہ میرے چاہنے والوں میں ایک ہی طبقہ کے لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی کیوں دکھائی نہیں دیتے جو مجھے دل د[redacted] رکھتے تھے۔

تشنہ نے جہاں حب الوطنی سے سرشار ہو کر مادرِ وطن سے اپنی محبت کا ثبوت دیا [redacted] انہوں نے سماج کی بے اعتدالیوں، بے راہ روی، سماجی برائیوں پر بھی ضربِ کاری لگائی ہے۔ شعری ادب میں انہوں نے کلاسیکی روایات کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔

خوں بہا میں صرف ۱۳ غزلیں شامل ہیں۔ غزلوں کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ مشاہدہ کی سچائی، جذبات کی تازگی اور موزونیِ طبع نے اچھے اچھے شعر تخلیق کئے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

بے کیفیِ حالات سے گھبرانے لگے ہیں
ہم بھی ترے کوچے کی طرف آنے لگے ہیں

یہ گرم ہوا کر نہ دے تاراج وطن کو
جن پھولوں کو کھِلنا تھا وہ مرجھا گئے ہیں

پھر یاد ستانے لگی ہے بیتے دنوں کی
پھر آپ ہی کچھ سوچ کے شرمانے لگے ہیں

تمہارا پار اُترنا سوال بن جائے
جلاؤ لوگو نہ اس طرح سے سفینوں کو

وقت کے ہاتھوں یہ افتاد پڑی ہے یارو
زندگی موت کے ساحل پہ کھڑی ہے یارو

[illegible] قدم، مرحلے اتنے
تم بجھاؤ گے تشنگی کیسے

[illegible] پہرہ، یہ ہمسفروں کی قطار
پھر بھی ہے رہزنی کے اندیشے

○

سیاست

جھیل کنارے۔ تنہا چاند (مجموعہ کلام)

(ڈاکٹر پریم بھنڈاری)

" غزل ہندوستانی ادب کی ایک غنائی صنفِ سخن ہے، اس کا جنم ایران میں ہوا، جہاں یہ عشقیہ جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنا رہا۔ بھارت میں آکر یہ روحانیت کے رنگ میں بھی رنگ گئی اور یہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ہمارے ملک میں اس کا ارتقاء بہت تیزی سے ہوا اور اب تو یہ اتنی مقبولِ عام ہو گئی ہے کہ اکثر ہندوستانی زبانوں میں اس کی تخلیق ہونے لگی ہے۔ پریم بھنڈاری ایک ذہین شخصیت کے مالک ہیں۔ غزل میں روایت سے ہٹ کر اپنی بات اپنے انداز سے کہنا ایک مشکل امر ہے لیکن یہاں بھی پریم بھنڈاری نے نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنی بات کو اپنے انداز میں کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق کا ایک گہرا احساس ہی نہیں بلکہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے غموں کا اظہار بھی بہت بے ساختگی کے ساتھ ہوا ہے "۔ یہ تحریر مسٹر سوہن سنگھ میواڑ کی ہے جنھوں نے " جھیل کنارے، تنہا چاند " کے ابتدائی صفحات میں پیش لفظ کے طور پر لکھ کر پریم بھنڈاری کی شاعرانہ صلاحیت کو خراج پیش کیا ہے۔

کوئی بھی زبان ہو، وہ کسی ایک کی میراث نہیں ہوتی۔ اُردو ادب میں ایسا

بیشتر مثالیں ملتی ہیں کہ جن دانشوروں کی مادری زبان اُردو نہیں ہے، انہوں نے بھی اُردو شعروادب میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ ایسے بھی بہت سے شاعر گذرے ہیں جو اُردو رسم الخط سے قطعی ناواقف تھے لیکن انہوں نے اُردو زبان میں بہترین شاعری کی ہے۔ ایسے شعراء عہدِ حاضر میں بھی موجود ہیں۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ مشہور گلوکاروں سے اُردو غزلیں سُن سُن کر غیر اُردو داں اصحاب نے اُردو زبان سیکھی ہے اور اُردو شعروادب سے اپنی دلچسپی کا عملی ثبوت بھی دیا ہے۔ پریم بھنڈاری کی مادری زبان اگرچہ کہ ہندی ہے لیکن وہ اُردو زبان و ادب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اُردو لکھنا پڑھنا اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ بات کوئی بھی مسلمان اُردو شاعر دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اُردو زبان کی ترقی و ترویج میں مسلمانوں کا ہی حصہ رہا ہے۔ ادبی و لسانی تاریخ گواہ ہے کہ اُردو زبان، اُردو شعروادب کو مالا مال کرنے والوں میں ہندو اہلِ قلم نے بھی غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں۔

ڈاکٹر پریم بھنڈاری نے شعبۂ موسیقی اور سماجیات میں ایم۔ اے کیا۔ غزل گائیکی پر تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر راجستھان یونیورسٹی جے پور نے انہیں ڈاکٹریٹ کے اعزاز سے نوازا ہے۔ پریم بھنڈاری کا نام اُردو شعروادب میں کچھ اتنا زیادہ مانوس نہیں ہے لیکن جہاں جہاں بھی ان کا کلام پہونچا ہوگا، یقیناً وہاں سننے اور پڑھنے والوں کو چونکا دیا ہوگا۔ اُردو زبان کے بہت سے ایسے شاعر بھی ہیں۔ جن کی مناسب انداز میں حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ پریم بھنڈاری کو بھی اُن ہی زمرے کے شاعروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شاعر ایک تازہ ہوا کی طرح اپنے بہترین اور اثرانگیز شاعری کے ساتھ اُردو شعری ادب میں داخل ہوا ہے۔ ان کا لب و لہجہ تازہ اور چونکا

دینے والا ہے۔ شعر کہنے کا اچھوتا انداز ہے۔ سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔
پریم بھنڈاری کے کچھ شعر ثبوت کے طور پر پیش خدمت ہیں۔

دل سے دل کی بات ہوئی تو … تو ہونٹوں سے کیا کہنا ہے
کاغذ پر ہونٹوں کو رکھ دیں پھر خط میں کیا لکھنا ہے

آج بھی شائد ہجر کا موسم بھاگ میں اس کے لکھا ہے
میری طرح ہے سویا سویا جھیل کنارے تنہا چاند

اس طرح سوکھے ہوئے بادل کبھی چھائے نہ تھے
شہر کی آنکھوں میں آنسو یوں کبھی آئے نہ تھے

اب تک گل برسائے اس نے پر اب خنجر آئے گا
بہت دنوں سے ڈر تھا جس کا اب وہ منظر آئے گا

سردی گرمی برکھا تینوں ایک ساتھ ہی بستے ہیں
تیرے بدن میں وہ جادو ہے سارے موسم رہتے ہیں

کبھی کبھی برتن ٹکرائیں گھر میں اچھا لگتا ہے — پھر اس سے زیادہ تجھ سے اور نہیں کچھ کہنا ہے

عمر بھر ریت پہ چلتا رہا لیکن وہ شخص — تپتی راہوں پہ ہری گھاس بچھا دیتا تھا

بات کیسی بھی ہو انداز نیا دیتا تھا — ایسا ہنستا تھا کہ وہ سب کو رلا دیتا تھا

جو تھا آنکھوں میں نئے خواب پرونے والا — ہے وہی اب مری پلکوں کو بھگونے والا

بستی میں قتلِ عام کی کوشش نہ بچ سکا — میں قاتلوں کے ذہن کی سازش نہ بچ سکا

جیسا بھی ہو اپنا گھر تو اپنا گھر ہی ہوتا ہے — اور دل کے بستر پہ یوں بھی نیند کہاں آپاتی ہے

تعلقات تو ٹوٹے مگر نہ جانے کیوں — مجھے وہ دیکھ کے رستہ نہیں بدلتا ہے

سب ٹھوکریں کھاتے ہیں، چلے جاتے ہیں لیکن پتھر یہ کسی سے بھی ہٹایا نہیں جاتا

سارے جھگڑے سمجھ کے ہوتے ہیں مجھ کو ہر شے سے بے خبر کر دے

آخری وقت یہ دعا ہے مری میرے دشمن کو معتبر کر دے

کان میں سیسہ گھول رہا ہوں باتیں سچی بول رہا ہوں

پیار ہے اُس کا سونے جیسا کیوں مٹی سے تول رہا ہوں

تیرے ہاتھوں بک جاؤں گا یوں تو میں انمول رہا ہوں

وہ کیا چین سے سویا ہوگا میری نیند کو پنکھ لگا کر

بہت جیئے اوروں کی خاطر اب تو کچھ اپنے بھی ہو لیں

پریم بھنڈاری اپنا شعری تعارف اِس طرح کراتے ہیں :-

" نہ جانے کب ذہن میں خیالوں کی گھٹائیں اُمڈنے لگیں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یاد ہے تو صرف اِتنا کہ سوچ اور سمجھ جس عمر میں آجانا چاہیئے اُسی عمر سے کچھ نیا لکھنے کی عام انداز سے الگ ہٹ کر کہنے کی خواہش جاگنے لگی۔ اُس عمر سے آج تک سانسوں نے جو کچھ دیکھا سنا اور محسوس کیا ہے اُنہیں خیالوں کے پھولوں کو الفاظ کے دھاگے میں پرونے کی کوشش ہے 'جھیل کنارے تنہا چاند'۔ شاعر جو کچھ دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے وہ سب ذہن کے کسی کونے میں جمع ہو جاتا ہے اور یہی سب چند لمحوں، دنوں یا سالوں کے بعد الفاظ کے پیکر میں اُبھرتا ہے۔ مجھے جو کچھ آج تک اپنے آس پاس کے ماحول سے ملا ہے اُسی کو لفظوں کا سہارا لے کر اب تک پہنچانے

کی کوشش ہے۔" جمیل کنارے تنہا چاند"
اِس مجموعۂ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں ایک صفحہ پر اُردو رسم الخط میں غزل ہے تو دوسرے صفحہ پر وہی غزل ہندی رسم الخط (دیوناگری) میں ہے۔ پریم بھنڈاری نکتہ حرف (۵۱) منتخب نمائندہ غزلیں اس مجموعے میں شامل کی ہیں۔ یہ کتاب مہارانا میواڑ ہسٹاریکل پبلیکشن ٹرسٹ اودے پور کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

(سیاست)

○

"اوراقِ گُل" (مجموعۂ کلام)

چندر پرکاش جوہر بجنوری

"چندر پرکاش جوہر بجنوری" الہ آباد کے ایک مشہور و مقبول شاعر تھے۔ وہ خالص غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی ہزار شیوگی کے عاشق۔ غزل نے بہت سرد و گرم زمانہ دیکھا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کی لہر آئی اُس میں بہت سے اچھے اچھے شاعر اپنی چال بھول گئے۔ انہیں شوقِ شہرت ایسا لے اُڑا کہ اپنے رنگ اور اپنے فن کی حرمت کا خیال نہ رہ گیا۔ جوہر اُس وقت بھی میانہ روی کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن رہے۔ اُنہیں غزل کی روایت اور مزاج کا جو عرفان ہے اور جس طرح اُنہوں نے اس کا ادراک کیا ہے اس سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا۔ اُن کی شاعری کلاسیکیت، شگفتگی اور سہلِ ممتنع سے عبارت ہے اور یہی صورت اُن کے تغزل کی تکمیل کرتی ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب شاعر کو اپنے رنگ اور غزل کے کلاسیکی مزاج کی تکریم کا احساس ہو" ـــــ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید محمد عقیل صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے "اوراقِ گُل" کے دیباچہ میں کیا ہے۔

چندر پرکاش جوہر جیسے عقیدت شعار، روایت پسند، تہذیبی اقدار کی

پاسداری کرنے والے شاعر کے پہلے مجموعۂ کلام کی پذیرائی ادبی حلقوں میں یقیناً ہوگی "اوراقِ گل" جوہر بجنوری کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ بہ الفاظ دیگر جوہر بجنوری کی شاعرانہ زندگی اور شعری خدمات کا حاصل ہے۔ "اوراقِ گل" کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روایت پرست ہونے کے علاوہ ترقی پسند رجحانات کو بھی اپنے شعری ادب میں جگہ دیتے ہیں اور عصری آگہی بھی رکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو شاعر کلاسیکی ادب کو اپنی فکر کا سنگ میل بناتا ہے وہ شاعر ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔ جس شاعر کی سوچ اور فکر میں اساتذۂ سخن کی شاعرانہ عظمت کی خوشبو ہو ایسا شاعر گلشنِ شعر و ادب کو ہمیشہ اپنے کلام سے جھلکاتا رہے گا۔ جوہر ایسے ہی شاعر ہیں جو کلاسیکی ادب کا دامن تھامے ہوئے اپنی اس معتبرانہ روییہ کو اپنے تمام شعری سفر میں یاد رکھتے ہیں۔ انھوں نے سیدھے سادے الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار موثر انداز میں کیا ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں مٹھاس ہے کلام میں روانی ہے سلاست ہے ان کے ہاں زبان و بیان کی پاسداری ہے۔ فن کا احترام ہے۔ تجربات وہ محسوس کرتے ہیں۔ شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ احساس کی شدت مشاہدات کی سچائی، جذبات کے خلوص نے ان کی شاعری کو معطر کیا ہے۔ پروفیسر جگناتھ آزاد یوں لکھتے ہیں:۔

> "مجھے جوہر کی شعریت میں رچا بسا اندازِ بیان پسند آیا ہے۔ ان کے کلام کی جس خوبی نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے ان کا متوازن لب و لہجہ ہے۔ یہ متوازن لہجہ کسی بھی شاعر کے لئے بہت بڑی دولت ہے اور یہ بغیر ریاضت کے ہاتھ نہیں آتا۔"

جوہر بجنوری کی غزل، روایت کے احترام کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ ان کی غزل

قدیم و جدید کا ایک خوبصورت امتزاج بن گئی ہے کہ یہ ہر قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں یوں تو بہت سے اچھے اچھے شعر ہیں۔ کچھ شعر قارئین کی نذر کر رہا ہوں ؂

یہ دیکھنا ہے کہ منزل کسے میسر ہو
رواں دواں تری جانب تو قافلے ہیں بہت

کوئی بتائے کہ کس کس کا حل تلاش کریں
کہ عصرِ نو کے ملے آج مسئلے ہیں بہت

اے میرے ہم نشیں! بتا جو بھی ہو تیرا فیصلہ
چاہے ساتھ چل یا میرا انتظار کر

اس نئے اجالے سے تیرگی ہی بہتر تھی
روشنی کے پروانو! کیا یہی سویرا ہے

زباں کا عشق میں کیا کام گفتگو کے لئے
نگاہ کم نہیں اظہارِ آرزو کے لئے

چمن میں پھول تو کھلنے کو کھل گئے لیکن
ابھی نمو کی ضرورت ہے رنگ و بو کے لئے

بہارِ شام نہ رنگینیٔ سحر سے مجھے
نشاطِ دل ہے میسر تری نظر سے مجھے

ہم وہ اسیر تھے کہ رہائی کے بعد بھی
بیٹھے رہے قفس میں ہم بال و پر لئے

بہارِ بزم کہاں لٹ گئی خدا جانے
سحر ہوئی تو نہ پھر شمع تھی نہ پروانے

وہ شوق کیا کہ جو شرح و بیاں کا ہو محتاج
وہ عشق کیا ہے جسے تیری نظر نہ پہچانے

یہ وحشتِ دل آخر لائی ہے کہاں مجھ کو
کچھ راز نہیں کھلتا صحرا ہے کہ بستی ہے

سیاست ۱۹۸۹ء

روشنی اور خوشبو (مجموعۂ کلام)

حیات وارثی

ادبی محفلوں میں اِس بات کا تذکرہ رہتا ہے کہ فلاں شاعر مشاعرہ کا شاعر ہے اور فلاں شاعر کاغذ کا لیکن بعض شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جو دونوں حیثیتوں میں کامیاب رہتے ہیں۔ ہمیں مشاعروں میں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کون سا شاعر مشاعرہ کا ہے اور کون سا شاعر کاغذ کا۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ اکثر مشاعروں میں کاغذ کے شاعر مقابلتاً اتنا زیادہ کامیاب نہیں رہتے۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مشاعروں میں اکثر سامعین تفریحِ طبع کے لیے آتے ہیں اس لئے اُنہیں ایسے ہی شاعر زیادہ پسند آتے ہیں جو مشاعرے کے ہیں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مشاعرہ کے شاعروں میں ایسے شاعر جو شاعرانہ ترنم سے گریز کرتے ہوئے کسی ایک خاص لَے میں کلام سناتے ہیں تو کامیاب ہو جاتے ہیں اور ایسے شاعر عوام میں زیادہ مقبول ہو جاتے ہیں۔ کاغذ کے شاعر اُن سامعین کو زیادہ متاثر کرتے ہیں جن کا شمار دانشوروں میں ہوتا ہے۔ ہمارے مشاعروں کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ خاص طور پہ کمرشیل مشاعروں میں ہر دو قسم کے شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔

"روشنی اور خوشبو" حیات وارثی کا ۲۵ واں مجموعہ کلام ہے۔ مشاعروں میں حیات وارثی ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں، لیکن ان کا کلام پڑھنے کا بھی ہے اور سننے کا بھی۔ "روشنی اور خوشبو" میں بہت سے شعر ایسے ملیں گے جو قاری کو غور و فکر کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ حیات وارثی کی شاعری پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی اُردو کے اُن اہم شاعروں میں سے ایک ہیں جو زندگی کے نشیب و فراز سے مسکراتے ہوئے گذرتے ہیں، اور جو برسوں سے شعر و ادب کی متواتر خدمت کرتے آرہے ہیں۔

اِس کتاب میں محسنہ قدوائی کا ابتدائیہ "جیون کتھا سے" کے نام سے شامل ہے۔ وہ کہتی ہیں:۔

"مسلم دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے ہندوستان کے قدیم علمی روحانی و ادبی صحیفوں کو زمانۂ قدیم سے ترجموں کے ذریعہ دوسری زبانوں کا پیکر دینا شروع کر دیا تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں اس کام نے باضابطہ شکل اختیار کر لی۔ اکبر اعظم نے ایک اکیڈیمی قائم کر کے لسانی، قومی، ذہنی اور فکری ہم آہنگی کی بنیاد رکھی۔ عہدِ اکبر کے نامور عالم ملا عبدالقادر بدایونی نے بالمیکی رامائن کا فارسی ترجمہ کیا۔ فیضی نے مہابھارت اور لیلاوتی کا لسانی پیکر بدلا۔ حضرت امیر خسرو، عبدالرحیم خان خاناں اور ملک محمد جائسی نے اپنی مادری زبان کے علاوہ مقامی بولیوں پر طبع آزمائی کر کے فکری یک جہتی کو فروغ دیا۔ حیات وارثی بھی اسی سلسلے کے ایک

مستند ادیب و شاعر ہیں ۔"

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی حصے میں حیات وارثی کی ایسی ۹ تصویریں ہیں جو مختلف مشاعروں اور ادبی جلسوں سے متعلق ہیں۔ تصویروں کے نیچے کیپشن ہندی میں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام تصویریں شائد کسی سوونیر یا میگزین کے لئے اکٹھا کی گئی تھیں جو سہواً کتاب میں شامل کی گئیں۔ جس شاعر کے ۲۵ مجموعے شائع ہوئے ہیں، اس شاعر کے مجموعۂ کلام میں ایسی تصویروں کو شامل کرنا بے موقع معلوم ہوتا ہے۔ حیات وارثی کی شاعری سے متاثر ہوکر عرفان صدیقی یوں رقمطراز ہیں :-

"بات اگر حیات وارثی کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنے کی ہوتی تو شائد اتنا کہہ دینا کافی ہوتا کہ وہ ایک اچھے، سچے اور دردآشنا شاعر ہیں۔ حیات وارثی کی شاعری سب سے واضح، سب سے بڑا اور سب سے زیادہ قابل لحاظ تاثر یہ دیتی ہے کہ وہ تجربوں اور مشاہدوں کی سچائی، اظہار کے خلوص اور اسلوب کی دردمندی اور توانائی کی شاعری ہے۔ فکری شاعری میں حیات وارثی کے ساتھ چلیں تو کھلتا ہے کہ یہ ایک دردمند، اخلاص مشرب، پرامید، انسان دوست شاعر کی ہمسفری ہے۔ ایک ایسے مسافر کی ہمسفری ہے جسے اپنی منزل کا اور اپنے راستوں کا پتہ ہے ۔"

" روشنی اور خوشبو " سنہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ناشر خود

حیات وارثی ہیں۔ جملہ (۱۰۴) صفحات پر مشتمل اس کتاب میں دعائیہ، حمد، نعت، منقبت اور نظموں کے علاوہ (۵۷) غزلیں شامل ہیں۔ اس کتاب میں یوں تو بہت سے ایسے شعر ہیں جو دل کو چھو لیتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ شعر جن کو میں حاصلِ مطالعہ سمجھتا ہوں حسب ذیل ہیں ؎

عروج تیرہ شبی کو زوال دے یارب!
مرے نصیب کا سورج اُچھال دے یارب!

میں خالی سیپ ہوں مالک تُو موتیوں سے نواز
میں بے کمال ہوں مجھ کو کمال دے یارب!

جو بھی کہنا ہو تجھے میری طرف دیکھ کے کہہ
میرا چہرہ ترے جذبات کا آئینہ ہے

تمہیں دکھا کے دل داغ داغ کیا کرتا
میں دوپہر میں جلا کر چراغ کیا کرتا

میں نے گھر کے بکھرے لوگوں کو سنبھالا کیوں تھا
بس اسی جرم میں تن سے کٹ گئے شانے میرے

جو چاہتا ہے کہ منزل کو اپنی جادہ کر دے
قیام تھوڑا کرے اور سفر زیادہ کرے

ناتراشیدہ ہیں اب بھی ان کتابوں کے ورق
عمر بھر ہم جن کی تشریحات میں الجھا کئے

صدیوں سے ہے روز و شب چہروں کا سفر جاری
لمحات کا آئینہ تیرا ہے نہ میرا ہے

مقابل اپنے حقیقت کا آئینہ رکھنا
اندھیری رات میں دروازہ مت کھلا رکھنا

یہ سوز و کرب مجھے تجربوں نے بخشا ہے
جلا تا شمع تو دامن سے فاصلہ رکھنا

خود سے ملنے کے لئے بھیس بدل کر جانا
آئینہ خانے میں جانا تو سنبھل کر جانا

آئینہ سے ہم شکوۂ بیداد کریں کیا
حیراں ہیں کہ خود اپنے سے فریاد کریں کیا

--

۱۹۸۸ء
سیاست

شجرِ صدا (مجموعۂ کلام)

(سُریندر شجر)

سُریندر شجر کی مادری زبان پنجابی ہے، اُردو نہیں۔ وہ اردو میں شاعری اس لئے کرتے ہیں کہ یہ زبان انہیں اپنی مادری زبان پنجابی کی طرح عزیز ہے۔ میں یہ تو پوری طرح نہیں جانتا کہ وہ اُردو زبان، اُردو تہذیب اور اُردو شعر وادب سے کس حد تک واقف ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک اُردو کا شاعر پیراہنِ شعروادب کو، اپنے ابھرتے تخیلات، گہرے مشاہدات، تازہ واردات اور اپنے ذاتی تجربات کی خوشبو سے معطر کررہا ہے۔

اُردو زبان کسی کی میراث نہیں ہے، جب بھی کوئی شخص اس زبان کو اپنانا چاہتا ہے اس زبان میں گفتگو کرنا چاہتا ہے تو یہ زبان اسلاف کی خوشبو کی طرح اس کی سانسوں میں بس جاتی ہے اور اس کا دل و دماغ شائستہ و شگفتہ لمحوں کی طرح خوشبو کا سفر طے کرتا ہے۔ مختلف مذاہب و عقائد رکھنے والے دانشورانِ فکروفن نے اُردو زبان کو بھی ایک تہذیبی ورثہ کی طرح اپنے گلے سے لگایا ہے۔ ایسے ہی دانشورانِ فکروفن کے قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک فرد سریندر شجر بھی ہیں۔ انہیں اُردو میں شعر کہنا اچھا لگتا ہے۔ وہ اس گُر سے واقف ہیں کہ اُردو زبان سے والہانہ وابستگی ایک

انسان کو شائستہ بنا دیتی ہے۔ معاشرہ میں سر اُٹھا کر چلنے، مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے اور باوقار انداز میں زندگی کا سفر جاری رکھنے کی تلقین کرتی ہے۔

اُردو کی تمام اصنافِ سخن میں غزل کا بانکپن ہی کچھ اور ہے۔ غزل تمام اصنافِ سخن میں مقبول ترین صنف ہے۔ غزل کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب یہ ملک کی مختلف زبانوں میں کہی جارہی ہے۔ ہندی میں غزل کہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ تلگو میں ڈاکٹر داسر تھی مرحوم نے غزلیں کہیں، گیان پیتھ ایوارڈ یافتہ تلگو کے عظیم شاعر ڈاکٹر سی نارائن ریڈی ستارہ سے بھی تلگو میں غزلیں کہتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی اُردو غزل کے رسیا ہیں جو اُردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن اُردو زبان سے وہ نہ صرف واقف ہیں بلکہ اُردو زبان کی سحر کاری سے متاثر بھی ہیں۔ غزل گائیکی کے فن کو دورِ حاضر کے گلوکاروں نے بھی کافی بڑھاوا دیا ہے۔ چاہے وہ سرکاری تقاریب ہوں کہ خانگی محفلیں ہوں، محفلِ موسیقی میں اُردو غزل کو بڑی دلچسپی سے سُنا جاتا ہے۔

میں سریندر شجر کے تعلیمی پس منظر سے واقف نہیں ہوں، بہت ممکن ہے کہ شجر کو اُردو شاعری کا شوق مشاعروں اور محفلِ موسیقی میں غزلیں سُن سُن کر ہوا ہو۔ سریندر شجر کی شناخت اُردو ادبی حلقوں میں ایک باصلاحیت شاعر کی حیثیت سے ہوتی ہے جو اپنے نکھرے ستھرے، شگفتہ اور پُراثر لب و لہجہ کے لئے شہرت رکھتے ہیں وہ ایک نوجوان شاعر ہیں۔ بہترین کلام کے ساتھ ساتھ خوش گلوئی ان کی شہرت میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔ سریندر شجر نے ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے میں شرکت کی تھی۔

اچھی اچھی غزلیں ترنم میں سنا کر کافی داد وتحسین حاصل کی تھی۔ جب اس نوجوان شاعر کی منتخب غزلوں کا مجموعہ کلام "شجر صدا" پڑھنے کو ملا تو یہ اندازہ ہوا کہ یہ ہونہار شاعر بہت جلد شعری ادب میں اپنا ایک اچھا خاصا مقام بنا لے گا۔

سریندر شجر نے اعتراف کے طور پر لکھا ہے کہ "مجھے اس بات کا دل سے اعتراف ہے کہ میں کسی ادبی ماحول کا پروردہ نہیں ہوں۔ میرے بزرگوں کا ادب سے کوئی قابلِ ذکر تعلق نہیں رہا۔ پھر سریندر شجر مشہور شاعر امیر قزلباش سے مشورہ سخن کرتے ہیں، لیکن ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا شاعرانہ مزاج ان کا اسلوب ان کا انداز بالکل ان کا اپنا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بہت سے خوبصورت اور دل میں اترنے والے شعر کہتے ہیں۔ مشاعروں میں چھوٹی بحروں کی غزلیں سُنا کر داد و تحسین حاصل کرتے ہیں۔ ان کی شاعری سیدھے سادے لفظوں سے مزین ہے۔ ان کی شاعری میں فارسی، عربی کے مشکل الفاظ بہت ہی کم ملیں گے۔

کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر نے اُردو غزل کی نئی آواز کے زیر عنوان لکھا ہے کہ "سکھ دھرم کے ماننے والے بھی اُردو کی زلفِ گرہ گیر کے شروع سے اسیر ہیں اور اس فرقہ نے ہر دور میں اُردو کو اچھے قلمکار بھی دیئے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ پاکستان چونکہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے اس لئے صدیوں کی پروردہ ہماری مشترکہ تہذیب اب ختم ہو جائے گی، لیکن مقام مسرت ہے کہ ہماری تہذیبی روایت اس صدمے کو جھیل گئی۔ سریندر شجر ایک ایسے سکھ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جہاں شعر و ادب کا کچھ زیادہ چرچا نہیں تھا۔"

عنوان چشتی نے رائے دی ہے کہ " سریندر شجر اُردو کے ایک مخلص اور ہونہار

نوجوان شاعر ہیں' انہوں نے اپنے محوں شدہ خوابوں اور مجروح تمناؤں کو غزل کی اکائیوں میں بڑی خوبی اور خوبصورتی سے پیش کیا اور اپنی کیفیات اور تخلیقی تجربات کے اظہار کے لئے غزل کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔"

امیر غزل لیاشی کی نظر میں یہ مجموعہ شاعر کے ظاہر و باطن پر مرتسم آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں سے مرتب ہے۔ قیس رامپوری کہتے ہیں کہ یہ بات میرے لئے کچھ حیرت کا سبب نہیں کہ سریندر شجر' ذہن کے دریچوں میں جھانکنے والے شعر کہتے ہیں۔" شاعری کے مجموعہ کے لئے نہایت شگفتہ اور پُراثر نام ہونا چاہیئے جوکہ پڑھنے والے حضرات نام پڑھ کر کتاب کو دیکھنا چاہتے ہیں، کتاب کا نام تو جدید تر ہے، لیکن شاعری اتنی جدید نہیں ہے۔ ان کے صاف ستھرے سمجھ میں آنے والے شعر ملیں گے۔ کوئی شعر ایسا دکھائی نہیں دیا جس کا مطلب و مفہوم سمجھنے کے لئے مجھے زیادہ غور کرنا پڑا ہو۔ ان کی شاعری کو ہر مہذب انسان پڑھنا پسند کرے گا' یہ اس لئے کہ ان کی شاعری دل کی شاعری ہے دماغ کی نہیں۔ اس مجموعۂ کلام کے کچھ شعر نذر قارئین ہیں جو مجھے زیادہ پسند آئے ؎

جہاں میں خودکشی اپنی خوشی سے کون کرتا ہے
عداوت بے سبب یوں زندگی سے کون کرتا ہے

تری دی ہوئی زندگی یوں جیا ہوں
یہ لگتا ہے جیسے سزا پا رہا ہوں

مجھے خود کو محفوظ رکھنا ہے خود سے
میں خود ہی لٹیرا اور خود ہی ہوا ہوں

اسی کے حوالے سے بدنام ہوں
وہ قصہ جو میں نے سنا تک نہیں

یہاں تو آدمی ملنا محال ہے یارو
وہ چاہتے ہیں کہ پیدا مددگار مل جائے

زیست گر بے نقاب ہو جائے
سانس لینا عذاب ہو جائے

-۲۰-

سیاست ۱۹۹۲ء

انڈیا ویلفیر سوسائٹی جدہ کا ادبی میگزین (سوونیر) ۱۹۹۲ء

- مدیر: عارف قریشی - مرتب: ناظم الدین مقبول

باصلاحیت اہل قلم چاہے زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں یا دنیا کے کسی بھی خطے میں روز و شب کی رعنائیوں اور تلخیوں سے گذرتے ہوں، جب وہ میدانِ عمل میں قدم رکھتے ہیں تو اپنی پوری توانائیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو بہ حسن و خوبی انجام دیتے ہیں۔ کوئی بھی کام کیوں نہ ہو جب اس کام سے والہانہ وابستگی ہو جاتی ہے اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا جذبہ خیر دل و دماغ میں موجزن ہوتا ہے تو وہ پتھر کو آئینہ اور صحرا کو گلستاں بنا دیتا ہے۔ اور پھر ایسے فنکار جو فطری طور پر اپنے کام سے عشق رکھتے ہیں، جب کسی کام کا بیڑہ اُٹھاتے ہیں تو وہ سُرخ رُوئی کے ساتھ اس کو خوشگوار انجام تک پہونچا دیتے ہیں۔ ایسے ہی قبیلہ سے تعلق رکھنے والے دانشور، شاعر و ادیب ناظم الدین مقبول بھی ہیں، جنھوں نے انڈیا ویلفیر سوسائٹی جدہ کے زیر اہتمام منعقدہ عالمی مشاعرہ کے سلسلہ میں شائع ہونے والے ادبی میگزین (سوونیر) کی ترتیب و تزئین کی ذمہ داری لی تھی جس کو انھوں نے نہایت دیانتداری، ذمہ داری اور خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔

ناظم الدین مقبول جدہ کے باسلیقہ، شگفتہ مزاج، خوش اخلاق، بامروت مخلص ترین

معتبر انسان کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ سے وابستہ متحرک، فعال اور کارکرد نوجوان عارف قریشی نے انڈیا ویلفیر سوسائٹی جدہ کے عالمی مشاعرہ کے سلسلے میں ایک ادبی سوونیر کی اشاعت کا عزم مصمم کیا تھا، اُن کی نظر انتخاب ناظم الدین مقبول پر پڑی۔ اس ادبی سوونیر کے تفصیلی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس رسالہ کو مادر جامعہ عثمانیہ کی معرفت اُردو زبان وادب کے نام معنون کیا ہے۔ (۴) کلر میں شائع شدہ سوونیر کے سرورق پر آرٹس کالج (جامعہ عثمانیہ) کی تصویر اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ یہ دونوں عثمانین (عارف قریشی اور ناظم الدین مقبول) اپنے دانش کدہ سے کس قدر عقیدت رکھتے ہیں۔ عثمانین برادری کے جذبہ وتعاون ہی نے دونوں کو ایک اہم اور یادگار سوونیر کی اشاعت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا موقع فراہم کیا حیدرآباد کے لوگ دنیا کے کسی ملک میں کیوں نہ ہوں، زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے کارہائے نمایاں کی وجہ اہمیت کے حامل ہیں۔

زیر تبصرہ ادبی میگزین (سوونیر) انڈیا ویلفیر سوسائٹی جدہ کے عالمی مشاعرہ کے سلسلے میں جو ۳ ڈسمبر کو عظیم الشان پیمانے پر جدہ کے سب سے بڑے آڈیٹوریم دارالحکمہ میں منعقد ہوا تھا، شائع ہوا ہے، جس میں ہندوستان اور جدہ کے منتخب شاعروں نے شرکت کی تھی۔ اس مشاعرہ میں ہندوستان سے خمار بارہ بنکوی، حفیظ میرٹھی، امیر احمد خسرو، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، منور رانا، والی آسی اور منظر بھوپالی نے بھی شرکت کی تھی۔ مشاعرہ کی صدارت جناب ادریس دہلوی مدیر شمع نے کی تھی۔ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل نفیس کتابت، عمدہ کاغذ، بہترین طباعت سے آراستہ مصور اس سوونیر کے سرورق کے دوسرے صفحہ پر ڈاکٹر عبداللہ نصیب سکریٹری جنرل مسلم ورلڈ لیگ، عارف

قریشی (صدر)، محمد معین خاں (نائب صدر) اور علیم خاں فلکی (معتمد) کی دیدہ زیب تصویر دکھائی دیتی ہے۔ دیگر ابتدائی صفحات پر کنگ فہد، شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز، صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما، وزیراعظم ہند مسٹر پی۔ وی۔ نرسمہاراؤ کی ایک ایک صفحہ پر تصویر موجود ہے۔ اس سوونیر میں سیاست میں شائع شدہ مضمون میں ممتاز عثمانین ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی نے لکھا ہے کہ اپنی زبان کی تہہ دل سے خدمت کرنے والوں کی میں ہمیشہ عزت کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ تلگو میری مادری زبان ہے لیکن اُردو زبان کو بھی میں اپنی ہی زبان سمجھتا ہوں "اس لئے کہ یہ میرے ملک کی زبان ہے" جس کا جنم اسی مٹی سے ہوا ہے۔ اُردو ایک تہذیب یافتہ زندہ زبان ہے جو ملک کی بے شمار علاقائی زبانوں کے مقابلے میں بہت ہی کم عمر ہے۔ وہ ایک ایسی پُراثر دل موہ لینے والی زبان ہے جو دل و دماغ کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہے۔ یوں بھی اُردو غزل تو اُردو زبان کی آبرو ہے۔

اس سوونیر میں ضیاء الدین نیّر کا مضمون "اُردو کی پہلی یونیورسٹی"، طارق عزیز کا مضمون "ایک زبان، ایک تہذیب"، فرید الوحیدی کا مضمون "سعودی عرب میں اُردو"۔ محمد باقر کا مضمون "تارکانِ وطن کے اعداد و شمار۔ لمحۂ فکر" قابلِ مطالعہ ہے سوونیر میں تمام مدعو شعرا کا منتخب کلام، مختصر تعارف اور تصویر کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بزمِ عثمانیہ جدہ کے زیرِ اہتمام مختلف اوقات میں منعقدہ ادبی اجلاس اور شاعروں کے گروپ فوٹوز بھی نظر آئیں گی۔ کچھ اور تقاریب کی تصاویر بھی سوونیر کا حُسن بڑھا رہی ہیں۔ ممتاز دانشوروں، سیاسی، سرکاری، علمی و ادبی شخصیتوں کے

پیلملعہ نے بھی اِس سوونیر کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا ہے (جو اردو زبان کی اہمیت پر تبصرہ ہے)۔ ڈاکٹر ایم چنا ریڈی گورنر راجستھان، جناب عابد علی خان مدیر سیاست، سکریٹری جنرل مسلم ورلڈ لیگ ڈاکٹر عبداللہ نصیب، سفیر ہند برائے سعودی عرب جناب عشرت عزیز، قونصل جنرل ہند جناب سید محمد یٰسین ایم، خورشید عالم خان گورنر کرناٹک، مدیر شمع دہلی جناب ادریس دہلوی، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پروفیسر محمد نسیم فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، سلطان صلاح الدین اویسی ایم۔پی، زاہد علی خان منیجنگ ایڈیٹر سیاست، ڈاکٹر نعیم اللہ پرنسپل انڈین ایمبیسی اسکول، محمد حیات اللہ خان وائس پرنسپل انڈین ایمبیسی اسکول، سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش مسٹر این۔ جنار دھن ریڈی، ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری اُردو ترقی بورڈ ہند، ڈاکٹر شمس بابر، احمد الدین اویسی، ڈاکٹر سید زین العابدین ڈائرکٹر برائے اقلیہ مسلم تحقیق انسٹیٹیوٹ لندن، شریف اسلم، اور مصلح الدین سعدی کے پیامات قابل ذکر ہیں۔

مجلسِ انتظامیہ اور مجلس استقبالیہ کے ارکان کی چہرہ شناسی کے لئے ایک فُل صفحہ پر عارف قریشی، ضیاء الدین نیئر، حیات اللہ خان، راشد لکھنوی، مظہر الدین التمش، سید محی الدین علی عظمت، ایس ایم شمیم، سگد لکھنوی، معین خان، شجاع الدین قریشی، علیم خان فلکی، محمد حمید الدین، مرزا اسمٰعیل بیگ، محمد محبوب شریف منعم کی تصویریں شائع کی گئی ہیں۔

مدیر سوونیر عارف قریشی نے لکھا ہے کہ وطنِ اُردو سے ہزاروں میل دور جدہ میں ہندوستان کے ممتاز اُردو شعراء کا اجتماع ہر اعتبار سے ایک اہم واقعہ ہے۔

جدہ بلاشبہ ایک عالمی تہذیبی مرکز ہے۔ اُردو ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ ہماری شناخت ہے، ہماری پہچان ہے۔

سید محی الدین علی عظمت نے انڈیا ویلفیر سوسائٹی جدہ کا تعارف کرواتے ہوئے لکھا ہے کہ انڈیا ویلفیر سوسائٹی جدہ کے قیام کی مدت بہت ہی کم ہے۔ ۱۹۹۱ء میں ایک لاکھ ۵۰ ہزار کی خطیر رقم مستحق افراد میں تقسیم کی گئی۔ ۱۹۹۲ء میں سوسائٹی کی جانب سے ایک لاکھ ۴۰ ہزار ضرورت مندوں میں تقسیم کئے گئے۔ جدہ میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ضمن میں سوسائٹی پیش پیش رہی ہے۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر مشاعرہ 'میرا شہر میرے لوگ' نامی ادارہ کی جانب سے حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا جس کے ویڈیو کیسٹ کی رسم اجراء ڈاکٹر حسن الدین احمد صدر نشین اقلیتی کمیشن نے دی۔ اس مجلہ میں مدعو شعراء کے علاوہ سعودی عرب میں مقیم کچھ شاعروں کی بھی تخلیقات شامل ہیں۔ ٹائٹل کے آخری صفحہ پر تمام مدعو شعراء کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ اس سوونیر کی قیمت فی کاپی ۲۶ ریال ہے جو مشاعرہ میں مفت تقسیم کیا گیا۔

مجلہ کے صفحات ۹۶، ۹۷ ہمارے مہربان کے زیر عنوان اظہار تشکر کے طور پر مختص کئے گئے ہیں۔ مدیر مجلہ عارف قریشی سوونیر کے مرتب ناظم الدین مقبول کو اس طرح خراج پیش کیا ہے۔

> "خواجہ ناظم الدین مقبول کے ہم مشکور ہیں کہ جنھوں نے ہمارے تصور سے زیادہ ہمارا ساتھ دیا اور سوونیر کی ذمہ داری کو اپنا سمجھتے اور حد درجہ فرض شناسی سے پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ ہماری سوسائٹی کے رکن نہ ہوتے ہوئے بھی اُردو زبان سے ان کا یہ عشق قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید ہے۔"

سرگذشتِ دل

گلِ تازہ

"گلِ تازہ" مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ یہ نام مجھے بہت پسند ہے۔ اس نام کے ذکر ہی سے میری روح جھوم جھوم اٹھتی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں میری کتنی ہی جوان راتوں کا سوز و گداز، کتنی ہی بھیگی راتوں اور جلتے ہوئے دنوں کا شباب، سُلگتی ہوئی آنکھوں کی نمی اور تڑپتے ہوئے دل کا درد شامل ہے۔ کئی مہکتی ہوئی راتوں کا قرار، کئی دنوں کی بے تابیاں، کئی ناتمام، مبہم، خاموش آرزوئیں، زندگی کی کئی مسرتیں کئی اور اندیشیاں اور تلخیاں شامل ہیں۔ گلِ تازہ کی ایک ایک پنکھڑی پر میری بھیگی ہوئی پلکوں کی نمی اس کے ایک ایک ورق پر میرے دل کا خون شامل ہے۔ گلِ تازہ عطیہ ہے وقت کے ایک جانفزا اور کیف آور لمحہ کا۔ گلِ تازہ میرے نغمات کا حاصل ہے۔ گلِ تازہ میری زندگی کا دوسرا نام ہے۔

انسان کی زندگی میں غم ہی زیادہ ملتے ہیں۔ خوشیوں کی جھلک کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔ میری ساری زندگی میں شعلہ و شبنم کا امتزاج رہا۔ جس قدر میں نے مسکرایا ہے اس قدر رویا بھی ہے۔ "گلِ تازہ" اُن ہی لمحوں کی یادگار ہے۔

جب کبھی شعر کہتا ہوں تو خود کو تنہا نہیں پاتا، کوئی ساتھ رہتا ہے رگِ جاں کی طرح۔

کہتے ہیں کہ غزل میں موجِ صبا کی انگڑائیاں، شبنم کی رعنائیاں، شعلوں کی لپک، کلیوں کی مہک اور پھولوں کی تازگی ملتی ہے لیکن میں نے چاندنی راتوں کا سہاگ، بھیگی برسات کا خمار اور گلابی جاڑوں کی مستی محسوس کی ہے۔

انسان کی زندگی، فطرت کی روشنی اور دھندلکوں سے جنم لیتی ہے۔ ہر انسان اپنی دنیا کا خالق ہے یا یوں کہیئے کہ اس کی ایک علٰحدہ دنیا ہوتی ہے۔ زندگی، مسکراہٹوں اور آنسوؤں کا نام ہے۔ میں نے زندگی کو ہمیشہ اپنے مقابل پایا۔ آنسوؤں میں بھی میں نے مسکرانا سیکھا ہے۔

شاعری دراصل زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار حالات و تجربات کا نچوڑ ہے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ زندگی کے حقائق اور اپنے جذبات کی جیتی جاگتی تصویر کو ہو بہو پیش کروں۔ میری تمام غزلوں میں آپ کو میرے دل کی دھڑکنیں ملیں گی۔ یہ بات میں نے یہاں اس لئے لکھی ہے کہ "گُلِ تازہ" کے پڑھنے والے میری زندگی کے داخلی و خارجی پہلوؤں کا زیادہ نہ سہی کچھ تو اندازہ لگا سکیں۔

"گُلِ تازہ" میرا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں سنہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۵ء کی غزلیں شامل ہیں۔ سنہ ۱۹۶۰ء سے میں نے پابندی کے ساتھ شعر کہنا شروع کیا۔ "گُلِ تازہ" میں ایسی ہی غزلیں ملیں گی جو کسی خاص جذبہ اور حادثہ کے زیرِ اثر تخلیق ہوئی ہیں۔ "گُلِ تازہ" کے پڑھنے والوں کو کبھی مایوسی نہ ہوگی۔ کچھ شعر تو ایسے مل ہی جائیں گے جو ہر پڑھنے والے کو اس کی اپنی زندگی کے ناقابلِ فراموش لمحوں کی یاد دلائیں گے۔

یوں تو زندگی گذرتی ہے یا گذاری جاتی ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ انسان سے

اُس کے احساسات اور جذبات کو علاحدہ علاحدہ کردیا جائے تو پھر اس کی زندگی بے کیف ہو کر رہ جائے گی۔ ہر انسان کے پاس اُس کی اپنی زندگی کا ایک خاکہ ہوتا ہے وہ اپنی صلاحیتوں اور ذوقِ سلیم سے اُس میں رنگ بھرتا ہے۔ میں یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو "گلِ تازہ" میں میرے جذبات و احساسات رچے ہوئے ملیں گے۔ میں نے اپنی کسی غزل کو بھی حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ کون سی غزل مجھے زیادہ پسند ہے۔ یہ تو میں قارئین پر چھوڑ دیتا ہوں۔

انسان کا دل و دماغ مختلف احساسات و واقعات کی آماجگاہ ہے۔ ہماری زندگی میں آئے دن مختلف حادثات اور واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کے ہر معمولی اور غیر معمولی واقعہ کو میں نے بغور دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود کچھ حادثات اور واقعات ایسے بھی ہیں کہ جن کو چاہ کر بھی بھلا نہیں سکتا۔ اُنہیں واقعات و حادثات کا حاصل میری غزلیں ہیں۔

انسان کا سب سے بڑا سرمایہ اُس کا دل اور اُس کی دھڑکنیں ہیں۔ دل ہی انسان کے احساسات اور جذبات کا مرکز ہے۔ انسان کے غم میں کس قدر گہرائی ہے اس کا اندازہ ہر انسان کو ہوتا ہے۔ مسرتوں کے لمحوں میں سطحیت ہوتی ہے اور غموں کی ساعتوں میں گہرائی۔ خوشیوں کے میسر ہونے کے بعد بھی میں سمجھتا ہوں کہ انسان کا غم ہی ہمیشہ تروتازہ رہے گا۔ انسان اپنا غم بُھلانے کے لئے حالِ دل کئی طریقہ سے کہتا ہے۔ میں نے شاعری کا سہارا لیا اور میں نے اپنا سارا غم گلِ تازہ کی نذر کیا ہے۔

ویسے جس ماحول میں، میں نے آنکھیں کھولیں وہ ایک خوش حال گھرانہ ہے۔ میں نے حیدرآباد کرناٹک کے ایک تعلقہ ہمنا یاد میں ۲۵ جنوری ۱۹۳۵ء کو ایک زمیندار

خاندان میں جنم لیا۔ میرے اسلاف کا پیشہ زمینداری اور تجارت ہے۔ میرے والد الحاج محمد شمس الدین ایک صوفی منش اور خدا ترس بزرگ تھے جو جامع مسجد تعلقہ ہمنا باد کے خطیب ہونے کے علاوہ ایک کامیاب تاجر بھی تھے۔ میں نے ابتدائی اُردو اور عربی کی تعلیم اپنے تایا سے حاصل کی اور جب میں نے اسکول کی تعلیم ختم کرلی تو تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لئے بھاگ متی کے شہر حیدرآباد کی جانب رُخ کیا لیکن والدہ کی یہ خواہش تھی کہ میں اپنی زمینات کی نگرانی کرتے ہوئے تجارت کے کاروبار سنبھالوں مگر ایسا نہ کرسکا۔ آخر کار میں نے اپنی والدہ کو منالیا' طلبِ علم کے جنون نے مجھے ہمنا باد چھوڑنے پر مجبور کیا اور میں حیدرآباد آگیا۔ پھر میں نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ علوم مشرقیہ کے اعلیٰ امتحانات اُردو عالم، اُردو فاضل، منشی فاضل، ادیب کامل کامیاب کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ میں آج بھی ان راہوں سے گذر رہا ہوں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ مجھے بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ پتہ نہیں میری زندگی کا سنگ میل کہاں ہے۔

اس مجموعہ کو پیش کرتے ہوئے مجھے چھ سال کی وہ تمام حیات افروز محفلیں یاد آرہی ہیں جن سے مجھے کسی نہ کسی طرح کی وابستگی رہی ہے اور جن سے میری روح کو بالیدگی اور تروتازگی ملی۔ اُن لمحوں میں سے کچھ لمحے مجھے گُلِ تازہ کی طرح عزیز ہیں۔

میں نے پابند، معرّا اور آزاد نظمیں بھی کہی ہیں لیکن مجھے غزل سے خاص دلبستگی ہے۔ صنفِ غزل کے بارے میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے' صرف اتنا عرض

کروں گا کہ اس کی دل نشینی اور دل نوازی نے ہر دور کے اُردو ادب کا ساتھ دیا ہے۔ میرے شعری ذوق کے نکھارنے میں حیدرآباد کی علمی، ادبی اور صحافتی حلقے ہمیشہ معاون ہی نہیں رہے بلکہ میری مناسب حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔

میرا اُردو کلام مجموعہ کی شکل میں شائع ہونے سے پہلے بھارت ساہتیہ کلا پریشد ضلع کھمم (آندھرا پردیش) نے میری غزلوں کا منظوم تلگو ترجمہ "تیتر گیتالو" کے نام سے شائع کیا جس کو خاص طور پر تلگو زبان کے ادیبوں اور شاعروں نے کافی پسند کیا اور اُردو حلقوں نے تلگو والوں کے خوش آئند جذبہ کی ستائش کی۔

"گلِ تازہ" کا انتساب میرے لئے اُلجھن کا باعث بنا رہا۔ کئی دنوں تک میں یہ سوچتا رہا کہ 'گلِ تازہ' کو کس نام سے منسوب کروں۔ میرے لئے یہ ایک مستقل سوال بنا رہا، بالآخر میں نے اپنی کتاب کو اس سوالیہ نشان سے منسوب کیا جو میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ اس سوالیہ نشان میں ان تمام لوگوں کو شامل کرتا ہوں جنھوں نے میرے بارے میں ایک لمحہ کے لئے بھی سوچ لیا ہو۔ اس سوالیہ نشان میں وہ "گلِ تازہ" بھی شامل ہے جس کی خوشبو میرے دل کے زخموں کے ساتھ ساتھ مہکتی رہے گی۔

--

(۱۹۶۵ء)

○

حدیثِ دل

(زخموں کے گلاب)

اس مجموعے میں دیکھیے کہ شاعر سرگذشتِ دل کس انداز سے بیان کرتا ہے۔ زندگی اپنے آپ سے کچھ اس طرح اُلجھ گئی ہے کہ جس کا سلجھانا ہر ایک کے لئے آسان نہیں ہے۔ بکھری ہوئی زندگی مشکل ہی سے سمٹتی ہے۔ حیاتِ انسانی دراصل روشنی اور دھندلکوں سے عبارت ہے۔ بامراد زندگی مسکراہٹوں اور آنسوؤں میں جنم لیتی ہے۔ زندگی کی اُلجھنیں، حالات کے اُتار چڑھاؤ، اور ماحول کے نشیب و فراز، زندگی کے تلخ اور خوشگوار لمحوں کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ زندگی ہر شام دھیمی روشنی میں چمکتا ہوا دیا ہی نہیں، سلگتی رات کی پلکوں پر جگمگاتی ہوئی شمع بھی ہے۔

انسان کو اپنی زندگی میں غم ہی زیادہ ملتے ہیں۔ خوشیوں کے لمحات بھی آتے ہیں، لیکن ان کا تاثر دیرپا نہیں ہوتا۔ نشاطِ غم کے سہارے انسان اپنی زندگی کی نشاط افروز شگفتہ یادوں اور خوشگوار تلخ حقیقتوں کو اپنے سینے سے لگائے پھرتا ہے۔ زندگی میں ہمیشہ شہد و شبنم کا امتزاج رہا ہے۔

میری آرزوؤں اور چاہتوں کا نقشِ اول "گلِ تازہ" ۱۹۶۵ء میں

شائع ہوا تھا۔ "شبنم گیتالو" کے نام سے ۱۹۶۵ء میں زیر اہتمام بھارتی ساہتیہ پبلیشرز (آندھرا پردیش) میری غزلوں کا منظوم تلگو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ "زخموں کے گلاب" میرا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو میرے مجروح جذبات، لطیف احساسات اور بہتر زندگی کے لئے ابھرتی ہوئی امنگوں کا ترجمان ہے اور جس کے ورق ورق پہ میری بھیگتی پلکوں کی نمی اور میرے گداز دل کا سوز شامل ہے۔

"زخموں کے گلاب" "نکہت زار" کا تسلسل ہے جو میری فکر و نظر کا آئینہ دار ہے۔ "زخموں کے گلاب" میری اپنی بیتی ہوئی حیات کا آئینہ ہے۔ جس میں غزلوں کے علاوہ سماجی اور رومانی نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ پانے اور کچھ کھو دینے کی مسلسل کشمکش ملے گی۔ فن کار جہاں معاشرے کے غیر متوازن حالات پر ضرب کاری لگاتا ہے وہیں وہ حسن و عشق کے ابدی فیضان سے بھی دامن بھر لیتا ہے۔ انسانی زندگی سے اگر احساسات اور جذبات کو علاحدہ کر دیا جائے تو زندگی بے فیض اور بے کیف ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں اور جو کچھ محسوس کرتا ہوں لکھ لیتا ہوں۔ جہاں میری آنکھیں، ماحول کے بے نور چہروں کا تعاقب کرتی ہیں وہیں میرا دل، حسن و عشق کی لامحدود، لطیف کیفیات سے بھی آباد رہتا ہے۔ زندگی سے گریز کس طرح ممکن ہے معاشرے سے کٹ کر انسان کس طرح سانس لے سکتا ہے۔

ایسی شاعری چاہے کسی زبان کی ہو، وہ ادوار میں تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ اصناف سخن بدل سکتے ہیں، ہیئت میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے لیکن شاعری کی روح ہر تخلیق میں برقرار رہے گی۔ تجربے ہر دور میں ہوتے ہیں۔ ہر دور تجربوں کا دور ہوتا ہے لیکن وہی شاعری زندہ رہتی ہے جو زندگی کی صالح روایات، مثبت قدروں اور

حیات کے حسین پہلوؤں سے ہم آہنگ ہو اور جس میں جذبات اور احساسات کی تازگی شامل ہو۔ انسانی زندگی کے متوقع اور غیر متوقع حالات کو سمجھنا اور ان کو موثر اور بامقصد انداز میں پیش کرنا فنکاری ہے۔

میں شاعری میں کسی خاص ازم پر ایمان نہیں رکھتا۔ لیکن میں ایسی ہی شاعری پر ایمان رکھتا ہوں جو زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہو اور جو انسانی جذبات اور جمالیاتی احساسات کو متحرک کرنے کے علاوہ سماج کے سلگتے ہوئے جسم کو موسم بہار کا لباسِ فاخرہ پہناتی ہو۔ جو شاعری لطیف جذبات، حسین تخیلات اور نازک احساسات کی ترجمانی کرتی ہو وہ شاعری پڑھنے اور سننے والوں کے جذبات اور احساسات کو بھی حرکت میں لاتی ہے۔ میں نے اپنی شاعری میں وہی باتیں کہی ہیں جو مجھے اپنی زندگی اور ماحول سے ملی ہیں۔ میں ذات اور سماج کی دی ہوئی ان ہی سوغاتوں کے سوا کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میری غزلوں اور میری نظموں میں سچے جذبات ہیں۔ آج کے شاعر نے غزل کو اس کی صنف میں روایتوں کی پابندی کرتے ہوئے نیا لب و لہجہ دیا ہے اور اپنے نئے اسلوب سے اس مقبول صنف کو کچھ زیادہ ہی مقبول بنا دیا ہے۔

ہمارے روزمرہ کی زندگی میں آئے دن کتنے ہی واقعات و حادثات رونما ہوتے ہیں۔ انسان کا دل و دماغ مختلف خیالات و حادثات کا مرکز ہے۔ ہر فنکار اپنی زندگی کے معمولی و غیر معمولی واقعات پر نظر رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کچھ ایسے حادثات کا بھی شکار ہو جاتی ہے جنہیں وہ چاہتے ہوئے بھی بھلا نہیں سکتا۔ میں نے ہمیشہ زندگی کی فعال قدروں، اس کے روشن پہلوؤں اور اس کی صالح روایتوں کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ میری رومانی نظموں میں شکست خوردگی، مایوسی و

ناامیدی کا احساس ضرور ملے گا لیکن میرا یہ احساس، میرا یہ غم، نشاطِ غم کی کیفیت رکھتا ہے۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے اس کو وہ سب کچھ نہیں ملتا، پھر بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو وہ حاصل نہ کرتے ہوئے بھی حاصل کر لیتا ہے۔ منزل کا راستہ بھی منزل سے جدا نہیں ہوتا، وہ اسی کا حصہ ہے۔

"گلِ تازہ" کی طرح "زخموں کے گلاب" کا انتساب میرے لئے الجھن کا باعث بنا رہا۔ زندگی کا آئینہ میرے [illegible] میں نے "گلِ تازہ" کے انتساب میں سوالیہ نشان دیا تھا لیکن "زخموں کے گلاب" [illegible] دیانت داری کے ساتھ "گلِ تازہ" کے نام منسوب کرتا ہوں۔

۱۹۷۲ء

خوشبو کا سفر

"خوشبو کا سفر" میرا پانچواں شعری مجموعہ ہے جو تمام تر تازہ کلام پر مشتمل ہے۔ شعری ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کو میری شاعری کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوگا کہ میں نے ہمیشہ ہی زندگی کی صحت مند روایات، رجحانات، عمدہ نظریات اور زندگی کی مثبت قدروں کو اپنے شعری سفر کا ساتھی بنایا ہے۔

زندگی کی سچائی، روشنی کے وجود کی پاسداری اور شگفتہ احساسات، میرے ذہن و فکر اور شعور کے عکاس رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس میں میرے تجربات و احساسات بھی ہیں اور معاشرے کی سرگزشت بھی۔ جہاں میں نے اپنے داخلی احساسات اور قلبی واردات کو شعری پیکر دیا ہے وہیں میں نے خارجی ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے عصری زندگی کے مسائل کو اپنے ذہنی ردعمل کا اظہار بنایا ہے۔ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں لکھتا ہوں۔ محسوس کرتے اور لکھتے کا یہ سلسلہ اسی انداز سے یوں ہی جاری رہے گا۔

زندگی کو سمجھنے کا سلیقہ ہر شخص کو ہوتا ہے لیکن کوئی کس حد تک سمجھتا اور اس کو برتتا ہے۔ اس کی اپنی فہم اور افتادِ طبع پر موقوف ہے۔ زندگی شروع ہی سے روشنی کی واضح علامت رہی ہے۔ زندگی کا جائزہ اگر مثبت انداز میں لیا جائے تو روشنی کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا۔

دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح شاعری بھی ہر سچے فنکار سے اپنا حق مانگتی ہے۔

ہر شئے اپنی شناخت کے لئے سرگرداں ہے۔ شئے کی صحیح پہچان کے بعد ہی سکون کی تلاش شروع ہو جاتی ہے، لیکن تسکین کی خواہش ہمیشہ نامکمل رہی ہے۔

فن میں روایت کا تسلسل ضروری ہے۔ چراغ سے چراغ تو جلتا ہے لیکن کس کی لو کتنی تیز ہے، اس کا تجزیہ مشکل مسئلہ ہے۔ جب کسی تخلیق کار کا فن احساس اور آواز کے توسط سے کاغذی پیرہن اختیار کر لیتا ہے تو اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی تخلیق میں کیا کچھ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے، یہ جاننا قارئین کا کام ہے۔ "خوشبو کا سفر" تو اس لمحے سے جاری ہے جب سے میں نے خود کو رفتہ رفتہ محسوس کرنا شروع کیا۔ خود کو محسوس کرنا آسان نہیں ہے لیکن زندگی میں اچانک کچھ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جن سے انسان آشنا ہو جاتا ہے اور اس منصب سے اپنے آپ کو روشناس کراتا ہے۔ اس لئے کہ اپنی پہچان کے لئے دوسروں کی شناخت بھی ضروری ہے۔ "خوشبو کا سفر" انسان کو کبھی بھی ایک مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتا۔ مسلسل سفر، حوصلہ، توانائی اور روح کو تازگی بخشتا ہے۔ یہ سفر ازل سے جاری ہے۔ خوشبو کے سفر کی کوئی آخری منزل نہیں ہوتی۔ خوشبو کے سفر میں وہ تمام لوگ صدیوں سے شامل ہیں جنھیں آج تک نہیں معلوم کہ ان کا سفر کہاں ختم ہوگا۔ خوشبو کا سفر میرے جذبات، احساسات، اُمنگوں اور خیالات کا آئینہ دار ہے۔

اس مجموعے کی صورت گری کی محرک بعض ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن کی خوشبو میرے شعری پیکر میں رچ بس گئی ہیں۔ جن کی تازگی، پاکیزگی اور خوشگوار جھک کسی دور میں بھی بادِ صبا کی رہینِ منت نہیں رہی۔

--

۱۹۸۳ء

O

شکن در شکن

"شکن در شکن" کو میں نے "گلِ تازہ" کے نام سے ہی منسوب کیا ہوں۔ گلِ تازہ کے نام انتساب ہے میرے لطیف احساسات، شگفتہ جذبات اور شاعرانہ شستہ مذاقی کی شکن در شکن جولانی ہے۔

"گلِ تازہ" میری شاعری کا ایک خوبصورت آئیڈیل ہے، جس کے اطراف میری شاعری گھومتی ہے۔ گلِ تازہ کی خوشبو کئی برسوں سے میری نس نس میں بسی ہوئی ہے۔ اس سے مجھے کچھ ایسا جذباتی لگاؤ ہے کہ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کی ذات سے منسوب ہو چکا ہے۔ "شکن در شکن" دراصل "گلِ تازہ" کا ہی ایک تسلسل ہے۔

"شکن در شکن" میرا چوتھا مجموعۂ کلام ہے جس میں نعتیں، منقبت اور غزلیات کے علاوہ رباعی، مسائلِ موضوعاتی اور نذرِ عقیدت کے طور پر لکھی ہوئی نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کی بیشتر تخلیقات نہ صرف آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہوئی ہیں بلکہ اردو کے مختلف ادبی رسائل، روزنامہ سیاست اور دیگر اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں۔

مجھے اپنی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے، یہ تو قارئین کے ذوقِ سلیم پر منحصر ہے کہ وہ میری شاعری کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔

ویسے بھی میں گذشتہ ۲۰، ۲۲ سال سے شعری و ادبی ماحول سے وابستہ ہوں۔ میرے شفیق استاد، نامور نقاد و ترقی پسند ادیب ڈاکٹر حسینی شاہد نے میری شاعری کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے جن خوش آئند خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا اس کے لیے سراپا سپاس ہوں اور جن مفید مشوروں سے نوازا ہے، میں ان کی روشنی میں اگلا سفر جاری رکھوں گا۔

شکریہ کی فہرست میں یوں تو بہت سے نام آتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن کے پیار سے "شکن در شکن" کے صفحات ہمیشہ معطر رہیں گے۔

(۱۹۷۹ء)

رشتوں کی مہک

'رشتوں کی مہک' میرا چھٹا مجموعۂ کلام ہے جس میں 'خوشبو کا سفر' کے بعد کے کلام کے علاوہ ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو میرے پچھلے مجموعوں میں شریک ہونے سے رہ گئی تھیں۔

مجھے سننے اور پڑھنے والوں نے محسوس کیا ہوگا کہ مجھے فطرت کی رعنائیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھی پیار ہے۔ زندگی کے تجربات نے مجھے جو کچھ دیا ہے، روز و شب کی کشمکش سے جو سوغاتیں ملی ہیں انہیں میں نے نہایت خلوص اور دیانت داری کے ساتھ شعری پیرہن میں ڈھال دیا ہے۔

میری شاعری زندگی کے تجربات اور مشاہدات، داخلی جذبات و محسوسات سے عبارت ہے۔ زندگی کے حقائق، روزمرہ کی الجھنوں اور راحتوں نے میرے احساس کو جگایا ہے۔ میرا شعری سفر ان ہی لازوال کیفیات کی دین ہے۔ اس شعری سفر کے دوران مجھے مختلف مراحل سے گزرنا پڑا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر ثابت قدم رہوں۔ میں نے اپنے شعری سفر میں متوازن ادبی رویے کو اپنایا ہے۔ مسلسل سفر کو زندگی کی روشن علامت سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی بھی کسی مخصوص تحریک یا گروہ سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ فنکار گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر ہی اچھا فن تخلیق کر سکتا ہے۔ جب میں نے

۱۹۶۵ء میں اپنا پہلا مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" شائع کیا تو ادبی حلقوں نے بے حد سراہا۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں "زخموں کے گلاب"، ۱۹۷۶ء میں "صنم تراش" ۱۹۷۹ء میں "شکن در شکن" کی اشاعت عمل میں آئی۔ "خوشبو کا سفر" میرا پانچواں مجموعۂ کلام ہے جو ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ "گلِ تازہ" کے بعد کے تمام شعری مجموعوں کو ملک کی مختلف اردو اکیڈیمیوں نے ایوارڈز سے نوازا ہے مجھے یقین ہے کہ پچھلے مجموعوں کی طرح "رشتوں کی مہک" کو بھی پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جا سکے گا۔ "

۱۹۸۶ء

یہ کیسا رشتہ ہے؟

صاحبانِ فکر و نظر یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک تخلیق کار کو کیسے کیسے انسانی رشتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ انسانی رشتے ہی تو ہوتے ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسان کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہ انسانی رشتے ہی تو ہوتے ہیں جو ایک انسان کو نہ صرف اپنی قربت کا احساس دلاتے ہیں بلکہ فاصلوں سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ یہ انسانی رشتے ہی تو ہوتے ہیں جو ایک انسان کو زندگی کی بلندیوں اور پستیوں سے واقف کراتے ہیں۔ اگر انسان کسی نہ کسی رشتے سے وابستہ نہ ہو تو زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہوگا۔ بعض رشتے اگرچہ بے نام سے ہوتے ہیں لیکن ان کا ہر لمحہ اپنی پہچان کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ میری کتاب "یہ کیسا رشتہ ہے" میں یہی سب کچھ ہے۔

"یہ کیسا رشتہ ہے؟" میری زائد از ۲۵ سالہ شاعرانہ زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں میری شاعری کے وہ تمام پہلو شامل ہیں جو ہر نئے موسم کی تازہ ہوا کی طرح میرے احساسات و جذبات میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ میں نے اس مجموعۂ کلام کا نام "یہ کیسا رشتہ ہے؟" اس لئے بھی رکھا ہے کہ وہ تمام انسانی رشتے جو کاغذی پیرہن اوڑھے ہوئے ہیں کسی نہ کسی طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ میری زندگی کے شب و روز سے وابستہ ہیں۔

ان نظموں کو پڑھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ماضی کی کتاب کا ایک ایک ورق اُلٹتا جا رہا ہوں۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے ماضی کی کبھی نہ بھلائی جانے والی لازوال یادوں میں کچھ اس طرح کھو جاتا ہوں کہ "خوشبو کا سفر" کے تمام خوشبو نواز لمحے میری روح کو مہکاتے ہیں۔ میرے احساسات و جذبات میں ایک خوشگوار لہر دوڑ جاتی ہے۔ میری بیشتر نظمیں شخصی اور ذاتی واقعات و واردات سے عبارت ہیں۔ میری شاعری میں میرے ذاتی تجربات اور قلبی واردات کے علاوہ وہ سب کچھ ملے گا جو وقتاً فوقتاً مجھے حالات کی گرمی و نرمی اور معاشرے کے محسوس اور غیر محسوس رویوں اور دھڑکنوں سے نوازا ہے۔ میں نے اُجالوں اور اندھیروں کے ٹکراؤ کی تصویر کھینچی ہے۔ زندگی کی مختلف النوع کیفیات کو اشعار میں سمو دیا ہے۔ روٹھنے اور منانے کی باتیں کی ہیں۔ دوستوں اور محسنوں کے سامنے میری نظریں احتراماً جھکی ہیں۔ لیکن اُسی کے ساتھ ساتھ منافق اور خود پرست انسانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے گفتگو بھی کی ہے۔

اپنے شعری سفر میں کسی بھی مرحلے پر میں نے اپنی شخصیت، اپنی وضع داری اور اپنی شاعرانہ روش کو ٹھیس پہنچنے نہیں دی۔ میں سماج اور معاشرہ سے ٹکراتا رہا۔ ٹوٹتا، بکھرتا رہا اور اس طرح میری شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی رہی۔ ٹوٹنے اور بننے کا یہ عمل برسوں جاری رہا اور آج بھی اسی ٹوٹنے اور بننے کے حیات بخش عمل سے گذرتا رہتا ہوں۔ اسی طرح میرا سفر جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔ میں نے اپنے قدم اپنی زمین پر ہی جمائے رکھے ہیں۔ میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں۔ اس لئے خلاؤں میں بھٹکتے رہنے کا قائل نہیں ہوں۔ یہی میرا فلسفۂ حیات ہے۔ یہی

مسلکِ زندگی اور یہی میرے فکروفن کا رویہ بھی۔

میری شاعری کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے یہ مجموعۂ کلام میرے خیالات وجذبات کی مکمل رہنمائی کرے گا۔ میری ہر نظم کسی نہ کسی اہم یا غیر اہم واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ کوئی ایک نظم بھی خیالی یا قیاسی نہیں ہے۔ میں ایسی ہی شاعری کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں جو زندگی کی روشن اور تعمیری اقدار کی ترجمان ہو۔ میری شاعری اور میرے نظریۂ فکروفن میں کلاسیکی قدروں کے ساتھ ساتھ آپ کو ترقی پسند رجحانات اور عصری آگہی کی مثبت علامتیں بھی ملیں گی۔ میں اُن تمام باوقار پُرخلوص اور محبت شناس شخصیتوں کا بھی سپاس گذار ہوں، جنھوں نے زندگی کے مختلف مرحلوں پر مجھے متاثر کیا ہے۔ میں اپنی زندگی کے اُن مرکزی اور غیر مرکزی کرداروں کو بھی یاد کرتا ہوں جن کی خوشبو کی مہک میری نظموں کے ایک ایک حرف میں بسی ہوئی ہے۔ آخر میں اُن تمام پاکیزہ رشتوں کو سلام کرتا ہوں جن کی دعاؤں کے اثر نے مجھے طوافِ خانۂ کعبہ اور زیارتِ گنبدِ خضرا کی برکتوں اور فیضان سے سرفراز کیا۔ ۔۔

سنہ ۱۹۹۰ء

○

"سلسلہ پھولوں کا"

حیدرآباد کی میری زندگی، رشتوں کی دھوپ چھاؤں میں گذری ہے۔ کچھ رشتے تو میری زندگی کے لئے جزوِ کل کی حیثیت رکھتے ہیں تو کچھ رشتے معطر فضاؤں کی طرح دل و جان کا حصہ بن چکے ہیں اور کچھ رشتے اپنی شناخت اور پہچان کے لئے معاشرہ کی ریشمی ڈوری میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان تمام بنتے سنورتے، ٹوٹتے اور بکھرتے رشتوں کے باوجود رشتوں کی مہک، روابط کی پاکیزگی، جذبات کی شائستگی، تقدس، اور وارداتِ قلبی کی ماہیت میں کچھ فرق نہیں آیا۔ زندگی کے بعض ایسے روشن پہلو بھی ہوتے ہیں جن کی ایمائیت اور نشاندہی سے بھی انسانی رشتے لازوال ہو جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض رشتے اپنی شناخت کے لئے اپنے ہی ماحول میں برسوں اپنی تلاش جاری رکھتے ہیں۔

حساس طبع لوگ جب بھی زندگی کے نازک لمحات کو پیراہنِ گل سے نوازتے ہیں تو ماحول کی کشمکش اور معاشرے کی نرمی و گرمی سے بھی گذرتے رہتے ہیں۔ ایسے حالات سے جب انسان رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتا ہے تو اُس کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ انسان اپنی شناخت کے لئے دوسروں کی پہچان کا بھی سہارا لیتا ہے۔ ایسی کیفیات ان ہی لمحات کی دین ہوتی

ہیں جو ایک حساس انسان کے مقدر میں آتی ہیں۔ ان تمام کیفیات کی ایک شکل کبھی ہوتی ہے۔ کبھی تو یہ شکل رحمت نواز لمحوں کی صورت میں نقشِ اول بن کر ابھرتی ہے تو کبھی ام ہانی طرزِ حیات کی طرح نقشِ ثانی بن کر ظہور پذیر ہوتی ہے اس پس منظر میں کہیں ظلمتِ جسم و جاں اختر شناسی کرنے لگتی ہے تو کہیں عشرتِ زندگی فرزانگی کا تسلسل نظر آتی ہے۔ نقشِ اول جہاں ظلمت دنیا کے اجالوں اور خوشبو سے تن من کو مہکاتی رہتی ہے تو وہیں نقشِ ثانی عشرتِ فرزانگی سے شامِ دل کو معطر کر دیتا ہے۔ زندگی ان ہی نقوش کی چھاؤں میں گزر رہی ہے۔ مجھے جتنا تعلق "گلِ تازہ" سے ہے اتنا ہی "زخموں کے گلاب" سے بھی ہے۔ یہ دونوں میری حیات اور شاعرانہ زندگی سے وابستہ ہیں۔ یہی سلسلہ جب طویل ہو جاتا ہے تو "صنم تراش" "شکن در شکن" "رشتوں کی مہک" "خوشبو کا سفر" "سفر جاری ہے اور یہ کیسا رشتہ ہے" تک پہنچ جاتا ہے۔

اظہارِ تشکر

ہر نئی کتاب کے بارے میں جب لکھنا شروع کرتا ہوں تو اظہارِ تشکر کی فہرست میں بہت سے نام مختلف شخصیتوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ ممتاز شاعر و نقاد ڈاکٹر علی احمد جلیلی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری تحریروں کو قابلِ توجہ سمجھ کر اپنی گراں قدر رائے سے کچھ زیادہ ہی نوازا ہے۔ صالحہ آپا کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ شکریہ جیسے تمام الفاظ اُن کے خلوص کے سامنے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فاطمہ تاج اور صالحہ آپا کا مشترکہ تعاون بھی مجھے یاد رہے گا۔

میں اپنے مرحوم استاد المحترم پروفیسر سیّد محمدؒ کے دیانت دار، ذمہ دار، خوش اخلاق فرزند مالک اعجاز پریس، عزیزم نور محمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ وہ اپنی طرزِ حیات کو اسی طرح برقرار رکھیں۔ اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے جزوی رقمی تعاون کیا ہے جس کیلئے میں اُردو اکیڈمی کا ممنون ہوں۔ جناب مسعود انور خوشنویس کے مسلسل تعاون نے مجھے اس قابل بنایا کہ بہت جلد کئی کتابوں کا مصنف و مؤلف بن گیا ہوں۔ مسعود انور نے اپنے دیانت دارانہ رویہ اور مکمل تعاون سے مجھے ہر ممکنہ سہولت پہنچائی۔ آخر میں ان تمام کرم فرماؤں کا سلام کرتا ہوں جو میری زندگی کی دھوپ چھاؤں میں میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

یکم جون ۱۹۹۳ء

صلاح الدین نیّر